

چون ایلیا

شاید



# اشعار

- ۱۱ جون ایلیا نیاز مندانه  
۳۹ ممتاز سعید سپاس گزارانه  
۳۰ معراج رسول دیباچہ طبع سوم و چہارم  
۳۱ شاید  
۳۳ رمز  
۳۵ نوائے درونی  
۳۶ شہر آشوب  
۵۰ اجنبی شام  
۵۱ وصل  
۵۲ اعلان رنگ  
۵۷ تعاقب  
۵۸ دوتی  
۶۰ برج بابل  
۶۳ بس ایک اندازہ  
۶۳ سلسلہ تمنا کا  
۶۵ قطعہ در ہجو ہم نشینان خود  
۶۷ ازیت کی یادداشت  
۶۹ در پچہ ہائے خیال  
۷۰ سزا  
۷۳ سوفسطا  
۷۶ اس رائیگی میں

۳۲ اخلاق نہ برتیں گے مولانا کریں گے  
 ۳۳ سوچا ہے کہ اب کل مسیحا نہ کریں گے  
 ۳۴ جانے کہاں گیا وہ، وہ جو ابھی یہاں تھا  
 ۳۶ جانے یہاں ہوں میں یا میں  
 ۳۸ دل ہے سوا لی تجھ سے دل آرا، اللہ ہی دے گا مولای دے گا  
 ۳۹ ہے فصیلیں اٹھا رہا مجھ میں  
 ۴۲ تنگ آغوش میں آباد کروں گا تجھ کو  
 ۴۳ جنوں کریں ہوس تنگ و نام کے نہ رہیں  
 ۴۴ جوت قرار بے دلاں شام بخیر شب بخیر  
 ۴۶ کس سے اظہار مدعا کیجے  
 ۴۹ گلے گلے بس اب یہی ہو کیا  
 ۵۱ منظر سا تھا کوئی کہ نظر اس میں گم ہوئی  
 ۵۲ وہ زلف ہے پریشاں ہم سب ادھر چلے ہیں  
 ۵۵ خود سے ہر دم ترا سفر چاہوں  
 ۵۷ سرکار اب جنوں کی ہے سرکار کچھ سا  
 ۵۹ نام ہی کیا تھاں ہی کیا خواب و خیال ہو گئے  
 ۶۰ کسی سے عہد و پیمانہ نہ رہو  
 ۶۳ زیر محراب ابراہاں خوں ہے  
 ۶۴ غبار محمل گل پر ہجوم یاراں ہے  
 ۶۸ تجھ سے گلے کروں تجھے جانیں منوں میں  
 ۷۰ ہم جو گاتے چلے گئے ہوں گے  
 ۷۲ پہنکی کامکان ہے اور در ہے گم یہاں  
 ۷۴ مرا اک مشورہ ہے التجا نہیں  
 ۷۶ یہاں معنی کا بے صورت صلہ نہیں

۷۸ بے اثبات  
 ۷۹ مگر یہ زخم یہ مرہم  
 ۸۱ جشن کا آسب  
 ۸۳ سر زمین خواب و خیال  
 ۸۸ معمول  
 ۸۹ رمز ہمیشہ  
 ۱۰۰ قطعہ  
 ۱۰۱ افسانہ ساز جس کا فریق و وصل تھا  
 ۱۰۳ گنوائی کس کی تمنا میں زندگی میں نے  
 ۱۰۵ ایذا دی کی داد جو پاتا رہا ہوں میں  
 ۱۰۷ جی ہی جی میں وہ جل رہی ہوگی  
 ۱۰۹ خوب ہے شوق کا یہ پہلو بھی  
 ۱۱۱ تو بھی چپ ہے میں بھی چپ ہوں یہ کیسی تھلی ہے  
 ۱۱۳ بے دلی کیا پونہی دن گزر جائیں گے  
 ۱۱۴ تیرا زیاں رہا ہوں میں اپنا زیاں رہوں گا میں  
 ۱۱۵ ہار جا اے نگاہ ناکارہ  
 ۱۱۷ ہیں عجیب رنگ کی داستاں گئی پل کا تو گئی پل کا میں  
 ۱۱۸ راض گروں سے داد طلب اچھن میں تھی  
 ۱۲۰ حال یہ ہے کہ خواہش پر سش حال بھی نہیں  
 ۱۲۲ سر ہی اب پھوڑیے ندامت میں  
 ۱۲۵ نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم  
 ۱۲۸ ہار آئی ہے کوئی آس مشین  
 ۱۳۰ سینہ دہک رہا ہو تو کیا چپ رہے کوئی

- ۲۱۸ میں تو سودا لیجے پھرا سر میں  
 ۲۲۰ وہ کلر گاہ ہوں جو عجب نادرست ہے  
 ۲۲۲ آج لب گہر فشاں آپ نے دان نہیں کیا  
 ۲۲۳ دل نے وفا کے نام پر کلر وفا نہیں کیا  
 ۲۲۴ گزر آیا میں چل کے خود پر سے  
 ۲۲۵ نکل آیا میں اپنے اندر سے  
 ۲۲۷ وہ جو تھے رنگ میں سرشار کہیں ہیں جانے  
 ۲۲۹ ہو کا عالم ہے یہاں نالہ گردوں کے ہوتے  
 ۲۳۱ شہر کا کیا حال ہے پوچھو خبر  
 ۲۳۲ ہلکے زخم تمنا پرانے ہو گئے ہیں  
 ۲۳۳ رنگ لایا ہے عجب رنج خمد آخر شب  
 ۲۳۵ اپنے جنوں کا پھر سرد سماں ہے خواب خواب

### آغاز شاعری سے ۱۹۵۷ء تک

- ۲۳۹ آسائش امروز  
 ۲۳۳ دو آوازیں  
 ۲۳۸ مفروضہ  
 ۲۵۱ عید زنداں  
 ۲۵۵ خواب  
 ۲۵۹ متاع زندگی لوٹا رہا ہوں  
 ۲۶۱ آزادی  
 ۲۶۳ بنام قدرہ  
 ۲۶۷ چشمک انجم  
 ۲۶۹ دلخ سینہ شب

- ۷۷ اب وہ گھراک ویرانہ تھا بس ویرانہ زندہ تھا  
 ۷۸ ہم کو سودا تھا سر کے مان میں تھے  
 ۷۹ ہم کہیں اور تم کہیں جاؤں  
 ۷۹ ہے رنگ ایجاد بھی دل میں اور زخم ایجاد بھی ہے  
 ۸۵ رقص جاں میں ہیں زخم سامان  
 ۸۷ شکل بھی اک رنگ کی ہو رنگ کی شب ہم نفسو  
 ۸۹ دل جان وہ آپنچا در ہم شکن دل ہا  
 ۹۱ بھٹکتا پھر رہا ہوں جستجوین  
 ۹۲ ایک ہی مژدہ صبح لاتی ہے  
 ۹۳ کسائی کیا کہ شوخ کے رخسار سرخ ہیں  
 ۹۶ خوش گذران شہر غم خوش گذراں گزر گئے  
 ۹۸ ہے بکھرنے کو یہ محفل رنگ و بو تم کہیں جاؤ گے ہم کہیں جائیں گے  
 ۲۰۰ ہم رہے پر نہیں رہے آباد  
 ۲۰۱ رویہ زوال ہو گئی مستی حل شہر میں  
 ۲۰۲ کیا ہوئے آشفقتہ کلراں کیا ہوئے  
 ۲۰۳ کوئی حالت نہیں یہ حالت ہے  
 ۲۰۶ نہ ہوا نصیب قرار جاں ہوس قرار بھی اب نہیں  
 ۲۰۸ زرد ہو آئیں زرد آوازیں زرد سر لے شام خزاں  
 ۲۰۹ ہم تو جیسے وہاں کے تھے ہی نہیں  
 ۲۱۱ کرتا ہے ہا ہوجھ میں  
 ۲۱۳ باد بہلری کے چلتے ہی لہری پاگل چل نکلے  
 ۲۱۳ عمر گزرے گی امتحان میں کیا  
 ۲۱۵ خامشی کہہ رہی ہے کلان میں کیا  
 ۲۱۷ شام ہوئی ہے یاد آئے ہیں یاروں کے ہم رلو چلیں

## نیازستانہ

یہ میرا پہلا مجموعہ کلام یا شاید پہلا اعتراف شکست ہے جو آئیس تیس برس کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ ایک ناکام آدمی کی شعری ہے۔ یہ کہنے میں بھلا کیا شرمناک کہ میں رائیگن گیا۔ مجھے رائیگن ہی چاہنا بھی چاہیے تھا۔ جس بیٹے کو اس کے انتہائی خیال پسند اور مثالیہ پرست باپ نے عملی زندگی گزارنے کا کوئی طریقہ نہ سکھایا ہو بلکہ یہ تلقین کی ہو کہ علم سب سے بڑی فضیلت ہے اور کتابیں سب سے بڑی دولت تو وہ رائیگن نہ جاتا تو اور کیا ہوتا۔

تعلیم محبت ۲۷۱  
ساحسن اتنی بڑی دلیل نہیں ۲۷۲  
وقت ۲۷۳

۲۷۹ ہے تمنا ہم نے شام و سحر یہ اکرین  
۲۸۱ ترے بغیر بھی فطرت نے لی ہے انگریزی  
۲۸۳ ذکر گل ہو خدا کی باتیں کریں  
۲۸۵ دست جنوں کو کلر نمایاں بھی ہیں عزیز  
۲۸۷ دھرم کی بانسری سے راگ نکلے  
۲۸۹ ستم شعلا نکلنے تلاش کرتے ہیں  
۲۹۱ مسک اٹھا ہے آنگن اس خبر سے  
۲۹۳ کیا ہے جو غیر وقت کے دھاروں کے ساتھ ہیں  
۲۹۳ کچھ دشت اہل دل کے حوالے ہوئے تو ہیں  
۲۹۳ اب جنوں کب کسی کے بس میں ہے  
۲۹۵ نہ کر قبول تماشائی چمن ہونا  
۲۹۶ نقشہ کامی کی سزا دو تو مزہ آجائے  
۲۹۷ سدری دنیا کے غم ہمارے ہیں  
۲۹۸ ہو بزم راز تو آشوب کلر میں کیا ہے  
۳۰۰ دل کے لہرمان مرستے جاتے ہیں  
۳۰۲ مستی حل کبھی تھی کہ نہ تھی بھول گئے  
۳۰۳ کبھی جب مدتوں کے بعد اس کا سامنا ہو گا  
۳۰۶ ہم غزال اک فتنن زمیں کے ہیں  
۳۰۸ غم ہارے روز گلر میں الجھا ہوا ہوں میں  
۳۱۰ قطعات

اب سے آتیس تیس برس پہلے میں نے اپنے بچپن کے دوست، قمر رضی سے وعدہ کیا تھا کہ میرا پہلا مجموعہ تھی چھوٹا گھر میں نے اپنا وعدہ وفا نہیں کیا۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں میرے بھانجے متن (ممتاز سعید) اور محمد علی صدیقی نے میرے مجموعے کا مواد مرتب کر کے میرے حوالے کیا تاکہ میں اسے چھوڑ دوں مگر میں نے ان کی خواہش بھی پوری نہیں کی۔ اس کے بعد زاہدہ حنانے سب سے زیادہ کلامی اور غزلیوں کی۔ میری جو نظمیں اور غزلیں ان کے ہاتھ لگیں، انہوں نے انکی کتب شروع کرادی مگر میں نے باقی چیزیں انہیں فراہم نہیں کیں۔ چنانچہ ان کی کوشش بھی بے نتیجہ رہی۔ اس کے کئی برس بعد میرے بھائی اور دوست معراج رسول نے مجموعے کی اشاعت کا ایک شان دار برنامہ بنایا مگر میں اپنی دس برس کی عذاب ناک بے خوابی اور اپنے دماغی دوروں کے باعث اس قابل نہیں تھا کہ اپنا مجموعہ مرتب کر سکوں.....

آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے اپنا کلام نہ چھپوانے میں آخر اتنا مبالغہ کیوں کیا؟ اس کی وجہ میرا ایک احساسِ جرم اور روحانی لڑتیت ہے، جس کی روداد میں آگے چل کر بتاؤں گا.....

یہاں میں اپنے اُن محسنوں، اپنے اُن محبوب اور محترم محسنوں کے نام گنانے کی سمرت حاصل کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میری تباہ کن اور عذاب ناک بیکاری میں میری غم گساری اور دل دلمری کی۔ اگر وہ میری غم گساری اور دل دلمری نہ کرتے تو مجھے نہ اسطو اور شیخ الرئیس کی منطبق خود کشی سے بچاسکتی تھی نہ بیکن اور ل کی منطبق..... وہ محبوب و محترم نام یہ ہیں۔ قبلہ و کعبہ پر و فیہ سرکار حسین، برادر محترم سید عابد علی شلہ، یار عزیز حسن امام جعفری، عزیز القدر اقبال ممدی (مشہور مصور) برادر دل جو معراج رسول، عزیز سلطان کاظمین، عزیز عزیزیاں شمس الدین صدیقی، مونث شام بیزاری، جمال احسانی، برادر مکرّم جناب منظور احمد (ڈھاکا)، جناب جمیل الدین علی، میرا ہم مشرب ندیم اختر جیبی حفظ باہلیم اور بھائی احمد الطاف۔

۱۹۸۶ء کا ذکر ہے، میری حالت گذشتہ دس برس سے سخت ابتر تھی۔ میں ایک نیم تاریک کمرے کے اندر ایک گوشے میں سہا بیٹھا تھا۔ مجھے روشنی سے، آوازوں سے اور لوگوں سے ڈر لگتا تھا۔ ایک دن میرا عزیز بھائی سلیم جعفری مجھ سے ملنے آیا۔ وہ چند روز پہلے دہلی سے کراچی آیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جون بھائی، میں آپ کو فرار اور گریزی زندگی نہیں گزارنے دوں گا۔ آپ نے مجھے میرے لڑکپن سے انقلاب کے، عوام کی فتح مند اور لاطبقاتی سماج کے خواب دکھائے ہیں۔ میں نے کہا۔

”تجھے معلوم ہے کہ میں مسلمانوں سے کس عذاب میں مبتلا ہوں؟ میرا دماغ، دماغ نہیں، بھول ہے۔ آنکھیں ہیں کہ زخموں کی طرح ٹپکتی ہیں۔ اگر بڑھنے یا لکھنے کے لیے کاغذ پر چند لہتوں کو بھی نظر جماتا ہوں تو ایسی حالت گزرتی ہے جیسے مجھے آشوب چشم کی شکایت ہو اور بلو تمہ میں جنم کے اندر جنم پڑھتا

پڑ رہا ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں اب بھی اپنے خوابوں کو نہیں ہارا ہوں۔ میری آنکھیں دکھتی ہیں مگر میرے خوابوں کے خشک چشے کی لہرس اب بھی میری پلکوں کو چھوتی ہیں۔“

سلیم نے کہا کہ میں آپ کو دینی اور المات کے دوسرے مشاعروں میں مدعو کرنے کے لیے آیا ہوں تاکہ آپ مجمع میں دلہیں آجائیں۔

مارچ ۱۹۸۶ء میں مجھے سلیم کے انتہائی اصرار پر دینی جانا پڑا۔ اور اس طرح دینی میں میرا ظہور مٹنی ہوا۔ وہیں ایک شام سلیم کے یہاں میں، سلیم اور یار عزیز منصور جلوید اپنے نجی اور ذاتی لمحے گزار رہے تھے۔ اچانک منصور نے کہا۔ ”جون! مجھے تمہارا مسودہ چاہیے۔“

شاید ایسا ہے کہ بعض رشتوں کی نسبت سے بعض لمحے، بعض بے حد ذاتی لمحے، بہت فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ وہ لمحے بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ میں نے منصور جلوید کے ہونٹوں کا کہا، سنا اور اس کی آنکھوں کا کہا مان لیا۔ مجموعے کی اشاعت کے منصوبے پر، عمل در آمد کرانے کی ذمہ داری سلیم کے سپرد ہوئی مگر میں نے اس منصوبے پر نہ ۱۹۸۶ء میں عمل ہونے دیا نہ ۱۹۸۷ء میں۔ آخر دونوں کے مسلسل اصرار سے مجبور ہو کر جولائی ۱۹۸۸ء میں اپنے اور اقی پریشاں لے کر بیٹھا۔

میں جس اذیت ناک حالت میں مجموعہ مرتب کرنے پر مامور ہوا تھا، اُس حالت میں شاید ہی کسی شاعر نے اپنا مجموعہ مرتب کیا ہو۔ میں اُس حالت سے کہیں زیادہ اذیت ناک حالت میں تھا اور ہوں، جس میں دسویں صدی عیسوی کے عظیم المرتبت ادیب اور مفکر ابو حیان توحیدی نے اپنے حالات سے تنگ آکر اور اس عہد کے ”بدوق امرا“ کی خوشنودی حاصل کرنے کی ناگوار مشقت سے بیزار ہو کر اپنی ناکام زندگی کے آخری لمحوں میں اپنی تصنیفات کے مسودے جلواد لیے تھے۔

اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اس مجموعے میں کون کون سی نظمیں اور غزلیں شامل ہونی چاہئیں؟ میں نے یہ فیصلہ خود نہیں کیا بلکہ جمال احسانی، ندیم اختر اور ممتاز سعید پر چھوڑ دیا۔ جب انہوں نے فیصلہ کر لیا تو میں نے اور برادر عزیز عنیق احمد نے اس کا جائزہ لیا اور ان سے اتفاق کیا..... اب جو سب سے اہم مرحلہ درپیش تھا، وہ ”غیر مطبوعہ“ کو ”مطبوعہ“ بنانے کا مرحلہ تھا۔ یہ سب سے اہم اور چال کاہ مرحلہ تھلیل عادل زادہ نے سر کیا۔ اگر تھلیل نہ ہوتے تو یہ مجموعہ شائع نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے صاحب دیوان بنانے میں سب سے اہم کردار تھلیل ہی نے ادا کیا ہے۔ ان کے ساتھ ان کے دفتر کے سادے رفقا کئی ہفتے تک صبح و شام مصروف رہے ہیں۔ ان میں اکرام احمد، ظہر عباس جعفری، سید حسن ہاشمی، سید افضل علی، سید بابر علی، یوسف مین، الیاس احمد اور صابر حسین پیش پیش رہے ہیں۔

مجموعے کی رونمائی کے موقع پر سلیم جعفری جو جملہ شائع کر رہے ہیں اس کے لیے آراء جمع کرنے اور مسودے کی عکسی نقول تیار کرانے کا تقریباً تمام کام میرے شاعر اور ادیب دوست اور چھوٹے بھائی

جب منظر علی خاں منظر نے انجام دیا ہے اور میرے بچپن کے دوست قمر رضی نے ان کے ساتھ مسلسل تعاون کیا ہے۔ منظر علی خاں کی مساعی کے بغیر مجھے کا صورت پذیر ہونا ممکن نہیں تھا۔ کتب کے لیے مسودہ صاف کرنے کا کام قمر رضی اور عزیز گرامی نقیس بڑی نے انجام دیا۔ میں منصور جلیو، سلیم جعفری اور اپنی طرف سے ان کا گھرے دلی جذبات کے ساتھ شکر یہ ادا کرتا ہوں۔ برادر عزیز عتیق احمد کا حسب محبت کی بے حسب کیفیات کے ساتھ میرے دل میں ہے۔

آخر میں مجھے سلتی کوثر کے غلام اور شہر کے رینڈ نیک نام سرفراز احمد خان یوسف زئی کا شکر یہ ادا کرنا ہے جنہوں نے میرے لیے ایک ایسی کیف آگئیں فضا پیدا کی کہ میرا ذہن تخلیقی کلام کرنے کے قابل ہو سکا۔

میں نے اپنے مجموعے کے لیے جو مقدمہ لکھا تھا، وہ سواد سو صفحات سے تجاوز ہو چکا ہے اور ہنوز نا مکمل ہے۔ معین وقت میں اس کی تکمیل و طباعت ممکن نہیں۔ اس صورت میں عزیز ہم انور (اور شعور) نے یہ مناسب سمجھا کہ اس ناتمام دیباچے کی تلخیص کر دی جائے چنانچہ اس کی تلخیص ہی پیش کی جا رہی ہے۔

میں دو آہ گنگ و جن کے حالت خیر، رحمت آمیز اور دل انگیز شہر امر وہہ میں پیدا ہوا۔ امر وہہ میں نہ جانے کب سے ایک کملاوت مشہور چلی آ رہی ہے کہ، امر وہہ شہر تخت ہے، گزران یاں کی تخت ہے، جو چھوڑے وہ کم بخت ہے،..... مجھے نہیں معلوم کہ شمالی ہند کے پہلے مشہور نگہ سید اسماعیل امر وہوی، شیخ غلام ہدائی مصغری، نسیم امر وہوی، رئیس امر وہوی، سید محمد تقی، سید صادقین احمد، محمد علی صدیقی اور اقبال مددی نے امر وہہ چھوڑ کر اپنے آپ کو کم بخت محسوس کیا تھا یا نہیں مگر میں نے..... بہر حال۔

وہ ایک مشرقی رویہ مکان تھا۔ اس کا طرز و دالان آخر شب سے آفتاب کا مراہبہ کیا کرتا تھا۔ اُس مکان میں رات دن روشنی طبع اور روشنائی کی روشنی پھیلی رہتی تھی۔ شعر و ادب کا سلسلہ ہمارے یہاں کئی پشتوں سے چلا آ رہا ہے۔ ہمارے بابا علامہ سید شفیق حسن ایلیا چل بھائی تھے اور چاروں کے چاروں شاعر تھے۔ سید نقیس حسن و نسیم، سید انیس حسن ہلال (بھائی کمال امر وہوی کے والد) سید وحید حسن رمز (اور گدا) اور بابا۔ بابا کے والد سید نصیر حسن نصیر بھی شاعر تھے۔ وہ صرف مستط کہتے تھے۔ بابا کے دادا سید امیر حسن امیر اردو اور قدسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ سید امیر حسن کے دادا سید سلطان احمد، میر تقی میر کے ارشد تلامذہ سید عبدالرسول نادر اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ ہمارے محلے کے جدِ اعلیٰ سید ابدال محمد انیس دلی سے اپنے ساتھ امر وہہ لے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی باقی زندگی ہمارے قدم دیوان خانے میں گزاری اور ہمارے جدِ اعلیٰ کے

مسائل نہیں ہیں۔ فلسفہ صرف تعلقاتی مسائل اٹھاتا ہے لیکن شاعری تعلقاتی، تخیلاتی، احساساتی اور جذباتی تمام مسائل سے سروکار رکھتی ہے۔

فلسفے کے مطابق کائنات کے شعبہ بندوست و تعلات میں اس امر کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا کہ آنے والے دن گزرنے والے دن سے بہتر ہوگا۔ وہ صرف شاعری ہے جو آنے والے کل کی خوش گواری امیدوں سے فرو اور سلج کو بہرہ یاب کرتی ہے۔ یہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شاعری تخلیقی اور فنکارانہ فریب خورنگی اور فریب دہی سے عبادت ہے۔

شاعری میرے ماحول میں جزوے از بغیر نہیں بلکہ مکمل بغیر سمجھی جاتی تھی۔ وہ بابا کی زبان میں ایک الوہی آہنگ، قدسی ترتیل اور قدسی ترنیم کی حیثیت رکھتی تھی۔

شعر کو عربی لفظ سمجھا جاتا ہے اور اسے شعور کا مادہ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ شعر، عبرانی لفظ ”شیر“ کا معرب ہے۔ اس کے معنی ہیں، راگ، خوش آوازی اور خوش آہنگی۔ میرے خیال میں وزن شعری بنیادی شرط ہے۔ میں ہنسی کے کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں جس نے نثر اور اعلیٰ سے اعلیٰ خوش آہنگ نثر لکھی ہو اور اسے اصطلاحاً شاعر قرار دیا گیا ہو۔

قدیم اور جدید صاحبان راے نے وزن کو شعری شرط نہیں قرار دیا۔ قریش کے شعری مصوروں کا موقف، قدیم صاحبان راے کے موقف کی بہترین مثال ہے۔ قریش نے قرآن کو شاعری اور آں حضرت کو شاعر قرار دیا تھا۔ قریش کے اس حسن ذوق کا ذکر میں بچپن سے سنتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن جب سے میں نے ایک شاعر کے طور پر ہوش سنبھلا ہے، اس وقت سے لے کر اب تک قریش کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب کہ مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ قریش نے قرآن کو شاعری کہہ کر کیا کہنا چاہا تھا۔ دراصل انہوں نے یہ بات کہہ کر قرآن کے حسن اسلوب کی تعریف کی تھی ورنہ وہ قدیم زمانے سے جس کلام کو شاعری سے تعبیر کرتے چلے آئے تھے وہ موزوں تھا۔

ہم جب مکالمات افلاطون یا نطشہ کی تحریروں کی داد دیتے ہیں تو انہیں شاعری کہہ اٹھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک چیز انداز تحسین ہے اور ایک چیز اصطلاح۔ ہمیں ان دو چیزوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ شاعری کی قدیم تاریخ سے لے کر آج تک ناموزوں کلام کو اصطلاحی طور پر کبھی شاعری نہیں کہا گیا۔ کم سے کم میرے علم میں یہی ہے۔

میں وزن یا آہنگ کے بغیر شاعری کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ یہ محض ایک نفسیاتی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ اخلاقی مسئلہ بھی ہے۔ یہ مسئلہ نفسیاتی اس لیے ہے کہ ہم اجماعی طور پر اور اتفاق راے کے ساتھ ایک خاص اسلوب کلام کو شاعری سمجھتے اور کہتے چلے آئے ہیں۔ سو جب ہم یہ سنتے ہیں کہ اس

یہ دو بعدی جنم ان کے ارتقائی، لاادری اور زندگی بنیے جون ایلیا کے حق میں سہ بعدی ہو گیا ہے اور وہ اس جنم کے درک اسفل میں جل رہا ہے، بھڑک رہا ہے، دہک رہا ہے مگر راکھ نہیں ہو پاتا۔ بلا اور وحی مسلمان اشرافیہ کے افراد کی اکثریت کے برعکس نسلی برتری اور طبقاتی تفریق کے سخت مخالف تھے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے یہاں ذاتی ملکیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے استعمال کی بنیادی اور ناگزیر اشیاء کو بھی ذاتی ملکیت میں شمار نہیں کرتے تھے۔ ”میرا ستر، میری چادر، میرا تکیہ، میرا بس، میری المدی“ اس نوع کے مفہام ذہن میں رکھنا اور انہیں زبان پر لانا وہ سخت غیر مذہب اور غیر شریف ہونے کی علامت سمجھتے تھے۔ مذکورہ الفاظ کے برعکس جو الفاظ ان کی زبان سے تقریباً روزانہ سنے جاتے تھے وہ تھے۔ ”ہلدی زمین، ہلرا نظام شعی، اور ہلدی کھکشل۔“ وہ سیاسی آدمی نہیں تھے، ایک عالم اور شاعر تھے۔ اگر وہ سیاسی آدمی ہوتے تو کیونٹ ہوتے۔

عطلد، مزخ، زہرہ اور مشتری وغیرہ کا ہلرے گھر میں اتنا ذکر ہوتا تھا جیسے یہ تیلرے ہلرے افراد خاند میں شامل ہوں۔ ”یوری نس“ اس زمانے میں نیا نیا دریافت ہوا تھا۔ بلا اس عزیز القدر کے بارے میں اتنی باتیں کرتے تھے کہ ان کو اس سے چڑ ہو گئی تھی۔ بلا کو زمین کی حرکت کے مسئلے کے سوا زمین کے کسی بھی مسئلے اور معاملے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں بچپن میں بے آرا می کے ساتھ اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ زندگی کے بارے میں بلا کا یہ رویہ ہلرے گھر کو تیلہ و بر باد تو نہیں کر دے گا۔ میں اندر ہی اندر چیخ و تاب کھاتا رہتا تھا۔ میں نے سا سال بعد اسی کیفیت میں بلا کی ایک جھوٹی۔ اس کا پہلا بند مجھے یاد رہ گیا ہے۔

زبان و ذہن کا بچیہ، زودہ زودہ جملہ  
 پختی ہوئی ہے ڈولائی بننے ہیں علامہ  
 وہ مسئلے ہیں کہ مفہوم زندگی گم ہے  
 ہے کس کو فہم کا یارا جناب فتلمہ

موسم سرما کی ایک سہ پہر تھی، میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ بلا مجھے شہلی کرے میں لے گئے۔ نہ جانے کیوں وہ بہت اداس تھے۔ میں بھی اداس ہو گیا۔ وہ مغربی کھڑکی کے برابر کھڑے ہو کر مجھ سے کہنے لگے کہ تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ میں نے پوچھا۔ ”بتائیے بلا! کیا وعدہ؟“

انہوں نے کہا ”یہ کہ تم بڑے ہو کر میری کتابیں ضرور چھپواؤ گے۔“

میں نے کہا۔ ”ببائیں وعدہ کرتا ہوں کہ جب بڑا ہو جاؤں گا تو آپ کی کتابیں ضرور ضرور چھپواؤں گا“

مگر میں بلا سے کیا ہوا یہ وعدہ پورا نہیں کر سکا، میں بڑا نہیں ہو سکا۔ اور میرے بلیا کی تقریباً تمام

تصفیفات ضائع ہو گئیں۔ بس چند متفرق مسودے رہ گئے ہیں۔ یہی میرا فہ احساس جرم ہے جس کے سبب میں اپنے کلام کی اشاعت سے گریزاں ہی نہیں، متنفر رہا ہوں۔

جس طرح بلا چل بھلتی تھے، اسی طرح اب سے ایک برس پہلے ہم بھی چل بھلتی تھے۔ رئیس امر وہوی، سید محمد تقی، سید محمد عباس اور میں۔ بڑے بھلتی ہلرے بلا اور ہلدی ان کی پھولاری کا سب سے بڑا اور سب سے خوش رنگ پھول تھے۔ وہ پھول گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ قاتل شاید ان کا مرتبہ شمس تھا۔ اسی لیے اُس نے ان کے دماغ کو لپٹا ہدف قرار دیا۔ بھلتی دماغ ہی تو تھے اور کیا تھے۔

میرے بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں بھائی کی شاعری عروج پر تھی۔ وہ رومانی اور انقلابی نظمیوں کہا کرتے تھے۔ وہ شاعری کا ایک ٹھانسیں ملتا ہوا مسندر تھے۔ انہیں غیر معمولی ذہین اور حسین کہہ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے بارے میں کچھ نہ کہا گیا ہو۔ جب وہ عربی کے حسن اور اس کی قادر الکلامی کا ذکر کرتے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے خود عربی لپٹا ذکر کر رہا ہو۔

بچھلے بھلتی سید محمد تقی بھی اُس زمانے میں شاعری کرتے تھے لیکن ان کا اصل میدان فلسفہ تھا۔ میں نے ان سے زیادہ مطالعہ کرنے والا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ وہ ایک تبحر عالم ہیں۔ میرے یہ دونوں بھائی اس زمانے میں وطن پرست کیونٹ تھے اور کھڈر کے کپڑے پہنتے تھے۔ اگر میں بھی اس وقت سن بلوغ کو پہنچ گیا ہوتا تو وطن پرست کیونٹ ہوتا۔ میرے نسلے بھلتی سید محمد عباس ہم بنانے کی ترکیب سیکھنے کے لیے بے تاب رہا کرتے تھے تاکہ سرکاری عملد میں ہم سے اڑا سکیں۔ وہ مجھے ہندوستانی انقلابیوں کے قصے سنایا کرتے تھے۔ مجھے انگریز سامراج سے نفرت دلانے میں سب سے اہم کردار انہوں نے ہی ادا کیا۔ میں نے اپنے بھائیوں سے جتنا سیکھا ہے، اس کا شاید ہی کسی کو اندازہ ہو۔

میری عمر کا انھوں سال میری زندگی کا سب سے زیادہ اہم اور ماہر اور در سال تھا۔ اس سال میری زندگی کے دو سب سے اہم حادثے، پیش آئے۔ پہلا حادثہ یہ تھا کہ میں اپنی نرگسی اٹا کی پہلی شکست سے دوچار ہوا، یعنی ایک قندہ لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا۔ دوسرا حادثہ یہ تھا کہ میں نے پہلا شعر کہا۔

چلہ میں اس کی تمانچے کھائے ہیں  
 دیکھ لو سرخی مرے رخلد کی

جس دن پہلا حادثہ پیش آیا تھا، وہ دن نہ ہفتے کے دنوں میں سے کوئی ایک دن تھا اور نہ مہینوں کے دنوں میں سے کوئی ایک دن۔ وہ دن تو سال کے تین سو پینسٹھ دنوں کے علاوہ ہی کوئی دن تھا۔ وہ تاریخ اور تقویم کا کوئی دن نہیں تھا۔ بلکہ زمان مطلق یا دہر (Absolutetime) کا کوئی دن تھا..... اگر زمان مطلق یا دہر کا کوئی دن فرض کیا جاسکتا ہو تو..... میں نے اظہار محبت کا جو طریقہ اختیار کیا



تھا وہ انتہائی عجیب و غریب تھا۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ اگر وہ سامنے سے آ رہی ہوتی تو میں اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے لڑکی، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اظہارِ محبت کو انتہائی ذلیل کام سمجھتا تھا اور اپنے اچھے دنوں میں، میں نے یہ ذلیل کام کبھی نہیں کیا۔

پلینٹس نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ”مجھے اس بات پر بہت ندامت ہے کہ میں جسم میں ہو کر پایا جانا ہوں“ میں بھی اُس زمانے میں اسی اہمقانہ انداز میں سوچا کرتا تھا۔ میں نے اپنی افلاطونی محبت کی جو یہ نیک تعمیر کی تھی، اس میں ہر وقت لوہان اور دوسرے بخورات کی خوشبو مہکتی رہتی تھی۔

ایک دن کا ذکر ہے وہ لڑکی ہمارے گھر آئی۔ میں اس وقت کھانا کھل رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی فوراً لقمہ نگل لیا، محبوبہ کے سامنے لقمہ چبانے کا عمل مجھے انتہائی ناشائستہ، غیر جمالیاتی اور یہودہ محسوس ہوا تھا۔ میں اکثر یہ سوچ کر شرمندہ ہو جایا کرتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر کبھی کبھی سوچتی ہوگی کہ میرے جسم میں، مجھ ایسے لطیف لڑکے کے جسم میں بھی معدے جیسی کثیف اور غیر رومانی چیز پائی جاتی ہے۔ اگر آپ تاریخ کے کسی ہیرو کا یا کسی دیوبی کا مجسمہ دیکھ کر یہ سوچیں کہ زندگی میں اس شخصیت کے جسم میں معدہ بھی ہوگا اور انتڑیاں بھی تو آپ کے ذہن کو دھچکا لگے گا کہ نہیں؟

میں نے اس زمانے میں اپنے گھر میں نہ جانے کس سے کچھ اشعار سنے تھے۔ ان اشعار نے میرے پورے عہدِ نوجوانی میں ایک موثر مگر سخت منفی کردار ادا کیا اور مجھے کئی برس تک کے لیے راہ سے بے راہ رکھا، وہ شعر یہ تھے۔

میرا مرنا ان کے گھر شادی ہوئی  
خون کے چھاپے لگے دیوار پر

مرتے دم تک رزا رہا خاموش  
جاں مگنی راز داریاں نہ گئیں

ہم ان سے نزع میں کچھ منفعیل ہیں  
پینہ موت کا کیا جبین پر

تھوکتا ہوں جو لوہے بوے تا آتی ہے  
جس پہ ہندی تری پستی تھی وہی سل ہے مجھے

ان اشعار میں عاشق ایک ایسا نوجوان نظر آتا ہے جس نے تپِ دق میں خون تھوک تھوک کر جان دی ہو۔ مجھے تپِ دق کی پہلی بہت جمالیاتی، شاعرانہ، ہیروانہ اور انقلابی محسوس ہوتی تھی۔ عام طور پر ذہین اور مفکر قسم کے انقلابی نوجوان اپنی شدتِ احساس اور اپنی بوہیمین اور بے بندوبد زندگی کے نتیجے میں اپنی صحت ہار جاتے تھے اور تپِ دق میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ وہ ذلتِ تصویریت پسندی کا زمانہ تھا، جس کے سحر میں ذہین نوجوان ہی نہیں من چلی لڑکیوں بھی مبتلا رہتی تھیں۔ اس زمانے میں باقی اور انقلابی نوجوان لڑکیوں کے ہیرو ہوتے تھے۔ یہ نوجوان کھمد کا پاجامہ، کھمد کا کرتا اور چہل پہنتے تھے۔ ان کے بل بڑے بڑے اور الجھے ہوئے ہوتے تھے۔

تپِ دق کی ”انقلابی پہلی“ جواں مرگی کی ایک جہں پر در مہانت تھی۔ میرا خیال یہ تھا کہ صرف وہیں بازو کے کانگریسی، مسلم لیگ، احراری اور خاکسار نوجوان ہی طبعی عمر کو پہنچ کر وفات پانے کی ذلت برداشت کر سکتے ہیں۔ کوئی انقلابی نوجوان یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے جواں مرگی میں ایک عجب مرموز اور محزون حسن محسوس ہوتا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں عربی کے حسن، اس کی قادر الکلامی اور جواں مرگی کا بہت ذکر ہوا کرتا تھا۔ ان تینوں چیزوں نے مل کر میری نظر میں عربی کو جعل و کمال کا ایک بے مثال مظہر بنا دیا تھا۔ میں بھی اُس زمانے میں جواں مرگی کی شدید آرزو رکھتا تھا۔ میری یہ آرزو تو پوری نہیں ہو سکی مگر حسن اتفاق سے پاکستان آنے کے بعد مجھے دق میں مبتلا ہونے کی لذت نصیب ہو گئی۔

میرے بچپن اور لڑکپن کا درمیانی دور سیاسی اقتدار سے بچد ہنگامہ خیز دور تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ قومیتوں کے مسئلے سے متعلق، اسٹالن نے جو موقف اختیار کیا تھا، اس کی روشنی میں ہندوستان کی کیونٹ پارٹی نے پاکستان کے مطالبے کی تائید کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ بہت سے کیونٹ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ ہمارے دونوں بڑے بھائیوں نے بھی مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اسرار الحق تجاڑ اور مخدوم محی الدین نے پاکستان کے ترانے کے تھے۔ بھائی (سید محرق) نے ایک کتابچہ لکھا تھا جس کا نام تھا ”پاکستان اسٹالن کی نظر میں“

آج یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان اسلام کے لیے بنا تھا۔ اگر پاکستان اسلام کے لیے بنا ہوتا تو کم سے کم کیونٹ پارٹی مطالبہ پاکستان کی تائید نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ اگر پاکستان اسلام کے لیے بنا ہوتا تو یہ ایک مذہبی معاملہ ہوتا لہذا مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت مذہبی علماء کو حاصل ہوتی۔ جنرل صاحب کے بجائے قائد اعظم کا خطاب کسی ”قبلہ و کعبہ“ یا کسی ”حضرت مولانا“ کو دیا گیا ہوتا۔ مسلم لیگ کی تحریک اپنے مزاج میں کلیسائی سیاست کی تحریک نہیں تھی۔ اسی لیے مسلمانوں کی اکثریت نے امامِ اہلِ ہند مولانا ابوالکلام آزاد کے مقابلے میں مسٹر محمد علی جناح کی دل

جان سے حمایت کی۔ بات یہ ہے کہ مسلم لیگ، خاص طور پر علی گڑھ کے طلبہ (جنس تعلیم کے بعد ملازمتیں درکار تھیں) زمیں داروں جاگیرداروں چھوٹے تاجروں چھوٹے سرمایہ داروں اور مغربی وضع قطع کے لوگوں کی نمائندہ ترین تنظیم تھی۔ یہ لوگ نہ مذہبی تھے نہ غیر مذہبی۔ یہ لوگ مولویوں کو ایک خاص تحقیر آمیز انداز میں "ملا" کہتے تھے اور یہ لفظ انہیں علامہ اقبال نے سکھایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی ایک معاشی اور سماجی تحریک تھی..... جس نے برصغیر کی ایک مشترک زبان کو شرف بہ اسلام کیا۔ مجھے مسلم لیگ سے سخت شکایت ہے کہ اس نے میری زبان کو ایک غیر تاریخی تاریخیت کا تماشا بنا دیا۔ کاش یہ مضحکہ خیز کھیل برصغیر کی دوسری زبانوں کے ساتھ بھی کھیلا جاسکتا۔

میں تقسیم سے پہلے اور اس کے چند سال بعد تک مذہبی علما کے صرف دو گروہوں کو قریب سے جانتا تھا، یعنی شیعہ علما اور دیوبندی علما۔ شیعہ علما کا موقف یہ تھا کہ صرف وہی حکومت اسلامی حکومت کلا سکتی ہے جس کا مقتدر اعلیٰ معصوم اور منصوص بن اللہ ہو۔ دوسری صورت میں مسلمانوں کی کوئی بھی حکومت جس کا مقتدر اعلیٰ چاہے کتنا بھی شفیق و پرہیزگار ہو، اسلامی حکومت نہیں کلا سکتی۔ حاصل یہ ہے کہ یہ علما کیلئے حکومت کے قائل تھے۔ عملی اور نظری طور پر یہی ان کا فیصلہ تھا اور یہی فتویٰ ہے۔ یہ حضرات سیاسی معاملات پر گفتگو کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔

علماے دیوبند وطن پرستانہ سیاست کے حامی تھے۔ آج یہ معاملہ بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مجھے ان علما کی جو تیاں سیلھی کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہ کسی طرح بھی دنیا دار قسم کے لوگ نہیں تھے۔ وہ درویشانہ زندگی گزارتے تھے اور انہوں نے افلاس اور فاقہ کشی کی زندگی رضا کارانہ طور پر اختیار کی تھی۔ میں عربی ادب اور فلسفہ میں ان کا ایک ادنیٰ شاگرد رہا ہوں۔ میں ان کا واحد شہری طالب علم رہ گیا تھا، جو اپنے ذاتی شوق میں عربی ادب اور فلسفہ پڑھ رہا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ مینے میں ان علما کی فاقہ کشی کا کیا اوسط تھا؟ جب میں ان کے بارے میں یہ سنتا تھا کہ یہ لوگ بیکے ہوئے ہیں تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ آپ اپنے نظریاتی حریفوں سے پوری شدت کے ساتھ اختلاف کیجیے مگر گالیاں تو نہ دیجیے۔

تقسیم سے پہلے کیونستوں کے سلسلے میں مذہبی علما کا مجموعی رویہ تقسیم کے بعد ظہور میں آنے والے مذہبی علما کے رویے سے یک سر مختلف تھا۔ شرعہ آفتاب کیونست سید سجاد ظہیر کی سعادت مندی اور لیاقت پر آل غفران مآب، علماے فرنگی محل، آل عیقات اور آل نجم الملت میں سے کسی کو کوئی شبہ نہیں تھا۔ اور ہمارے علاقے کے بلند مرتبہ انقلابی، کامریڈ ڈاکٹر اشرف کی دانش پروری اور آداب دہانی پر علماے دیوبند کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا تھا۔ اھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ کتب دیوبند ڈاکٹر اشرف

کی قہل ندر شخصیت کو مسترد کر کے اپنے عظیم الشان فرزند اور ڈاکٹر اشرف کے پیش زد مولانا عبید اللہ سندھی کے نام پر خط تانخ کھینچ دیا!

ہمارے ماحول کا اپنے غیر مذہبی نوجوانوں کے بارے میں بہت فرخ دلانہ رویہ تھا۔ علما، ان کے باغیانہ اور منکرانہ خیالات کو سن کر مسکرا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ مطالعہ کرتے رہے تو راہ راست پر آجائیں گے۔ ان لٹھ نوجوانوں کے حق میں جو سب سے زیادہ نامور ان بلکہ شدید فیصلہ صادر کیا جاتا تھا، وہ یہ تھا کہ پڑھ بہت لیا ہے اس لیے ہضم نہیں ہوا۔ میرے ماحول میں حسن و قبح اشیاء کو عقلی سمجھا جاتا تھا نہ کہ شرعی، یعنی چیزوں کو خوب یا زشت قرار دینے کا منصب عقل کو حاصل ہے نہ کہ شرع کو۔ شرع صرف انہیں امور کو جائز یا ناجائز قرار دیتی ہے جنہیں عقل جائز یا ناجائز قرار دیتی ہو۔ شرع عقل کا فیصلہ قبول کرنے کی پابند ہے نہ کہ عقل شرع کا۔ اس نرد و پیش میں جو حدیثیں عام طور پر سننے میں آتی تھیں وہ یہ تھیں۔

۱۔ علما کی روشنائی شہدا کے خون سے افضل ہے۔

۲۔ کافر عالم، جاہل مومن پر فضیلت رکھتا ہے۔

۳۔ تمہیں جو حدیث عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہو، اسے دیوار پر دبے مارو۔

اس گفتگو کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ معاشرہ کوئی توانا اور مثالی معاشرہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکا تھا اور اب اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا وہ معاشرہ "طبیبہ اشرف" یعنی شیخوں، سیدوں، مغلوں اور پشاوروں کا معاشرہ تھا۔ یہ "اشرف" اپنے محروم، پسماندہ اور پیشہ ور مسلمان بھائیوں کو بڑی حقارت کے ساتھ "اجلاف" کہتے تھے۔

یہ صدیوں کے مظلوم "اجلاف" اشرف کی رعیت کلاتے تھے۔ مگر اب سیاسی اور سماجی تحریکوں کے باعث وہ بیدار ہو رہے تھے۔ ان کی اکثریت قوم پرست تھی اور اشرف مسلم لیگ میں تھے یعنی جنگ شروع ہو چکی تھی۔

طبیبہ اشرف چونکہ صدیوں سے مراعات یافتہ رہا تھا، اس لیے زیادہ تعلیم یافتہ، مذہب اور تخلیقی تھا۔ میں نے اس کے وجود کے دھینے کی حالت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

تھے عجب دھیان کے در و دیوار

گرتے گرتے بھی اپنے دھیان میں تھے

۱۹۴۳ء میں میری عمر بارہ برس تھی۔ میں اس زمانے میں کبھی شعر کہتا تھا، کبھی جبران خلیل کے مبالغہ طرز احساس و خیال میں اپنی ایک خیلی محبوبہ صوفیہ کے نام خط لکھا کرتا تھا۔ وہ خط میری بیاض میں محفوظ ہوتے رہتے تھے۔ میں ان خطوں میں اپنی افلاطونی مگر زمکسی محبت کے اظہار کے ساتھ خاص

طور پر جو بات بلا لکھتا تھا، وہ یہ تھی کہ ہمیں انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے کچھ چاہیے۔ میرا خیال یہ تھا کہ میرے ہر وقت کے اشتعل، میری تلخ مزاجی، بے آرا می، بیزار اور دل برداشتگی کا ایک اہم سبب انگریز سامراج کی غلامی ہے۔

مجھے اپنے ان خطوں میں سے ایک خط کا ہندلا سا مفہوم اب بھی یاد ہے۔ یہاں میں اس خطا عبرت اور مفہوم کو اس کی اصل عبرت اور اس کے اصل مفہوم کی بھولی بھری ہیئت اور معنویت ساتھ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

ناظورہ معنی! تہلری پیشانی، ابروؤں اور پونوں کو ہزاروں، ہزاروں شبنمی پیار۔ میں نے اس پلا خط تمہیں استندریہ کے نچے پر ارسال کیا تھا لیکن سیدی ایلیا ابو ماضی (۱) نے مجھے قاہرہ سے لکھا ہے کہ تہلرا خاندان قاہرہ منتقل ہو گیا ہے۔ اب میں یہ خط قاہرہ کے پتے پر لکھ رہا ہوں۔

ہم ہندی ایک بچن میں زندگی گزار رہے ہیں۔ انگریزی ہمیں کبھی آزاد نہیں کریں گے۔ ہم کریں کیا کریں؟ ان کے پاس طیارے ہیں، توپیں ہیں، ٹینک ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم انہیں ہندوستان سے کس طرح نکل باہر کر سکیں گے!

میں دو سترتیں ایک ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تہلرا دیدار اور انگریزوں کا اوبد۔ تم مش راس الحسین میں حاضر ہو کر دعا مانگو کہ ہم اور تم زندگی کی سعادت علیا حاصل کر سکیں۔ شاید تمہیں اس بات کا اندازہ ہو گا کہ میں تمہیں کتنا یاد کرتا ہوں۔ عاطفۃ الخوری کو میری دعائیں پہنچانا اور اپنے ہاتھوں کوئی لٹ میری طرف سے چوم لینا۔

صوفیہ، میری صوفیہ! خدا حافظ  
تہلرا بچون فوضو!

اسی زمانے کی بات ہے کہ میرے سر پر ڈرامے کا سودا سوار ہوا۔ اس کا سبب ہلری برادری کے لوگوں کا ایک ڈراما کلب تھا۔ اس کا نام بزم حق نما تھا۔ یہ کلب انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ساز و سلان اور اپنی سینئروں کے اعتبار سے کسی طرح بھی بھئی یا کلکتہ کی کسی تھیٹر ریکل کمپنی سے کم نہیں تھا۔ اس کے ڈرامے رنج الاول کے وسط یا موسم گرما میں فصل کتنے کے بعد ایچ ہوا کرتے تھے۔ بزم حق نما کے ڈرامے مسلمان تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔ جن ان ڈراموں کے پیش نظریہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اسلامی تاریخ صرف پڑھی نہیں بلکہ سیکڑوں آدمیوں کے

(۱) ظاہر ہے کہ یہاں مشہور عربی شاعر ایلیا ابو ماضی کا نام محض زیب داستاں کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

درمیان بیٹھ کر دیکھی بھی ہے۔ ۶۰ھ مطابق ۶۸۰ء کا وہ منظر میرے سامنے کی بات ہے جب عبید اللہ ابن زیاد مسلم بن عمرو ہلبلی، شریک بن اعرود ہلدی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ سیوا علمہ باندھے ہوئے رات کے وقت کوفے میں داخل ہوا تھا۔ ابن زیاد کے لشکر نے توہین کے قائد سلیمان بن مرد خزاعی اور ان کے ساتھیوں کو میرے سامنے خون میں نہلایا تھا۔ میں نے امیر مختار ثقفی اور امیر ابن ہبم بن ماکب اشتر کو موالی اور شہویوں کے لشکر کے ساتھ خون حسین کا انتقام لینے دیکھا ہے۔ ابو مسلم خراسانی۔ ابو سلمہ خدال۔ محمد نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کا خلیفہ منصور کے حکم سے خون میں نہلایا جانا میرے سامنے کا واقعہ ہے۔ خاندان براءکہ، آل نوحخت، دیالہ اور آل بویہ کے افراد میرے دیکھے بھلے ہیں۔ ابوالسرایا، بسیری، فاطمی امام مستنصر باللہ، ابن بکس بدر الجمالی اور ابن علقمی میرے لیے کئی صدی پہلے کے لوگ نہیں، میرے لڑکپن کے لوگ ہیں۔ میں نے انہیں بولتے چلتے اور چلتے پھرتے دیکھا ہے۔

بڑوں کی نقل میں، میں نے بھی ایک ڈراما کلب قائم کیا تھا جو میرے ہی نام سے منسوب تھا۔ میں اس کا ڈائریکٹر تھا اور میرے دوست قمر رضی اس کے منجبر۔ ڈرامے میں سب سے اہم کردار میں ادا کرتا تھا۔ گویا میں ڈرامے کا ہیرو ہوتا تھا۔ مجھے میرے محلے سے باہر شاعر کی حیثیت سے بعد میں جانا گیا اور سب سے مقبول اداکار کی حیثیت سے پہلے۔ میں نے خود بھی ایک ڈراما لکھا تھا۔ اس کا نام تھا ”خونی خنجر“ یہ ڈرامے موضوعات اعتبار سے اموی، عباسی اور فاطمی دور کے عکاس ہوتے تھے۔ میں نے جو ایک زمانے میں بلند آہنگ اشتر کی نظمیں کہیں، ان پر میرے ایچ کے دور کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ میری بہت سی غزلوں کا مکالماتی لہجہ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔

کنٹ نے شاید اپنی کتب تنقید عقل محض (CRITIQUE OF PURE REASON)

میں کسی موقع پر مغربی ڈرامے کو شاعری کا سب سے اعلیٰ منظر قرار دیا ہے۔ میں ایک زمانے میں ٹومسکی، رام لیل اور ڈرامے کا دیوانہ رہا ہوں۔ مگر یہاں میں انتہائی نیاز مندانہ طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ڈراما اپنے جوہر میں شعری صنف کے اعتبار سے دوسرے درجے کی صنف ہے۔ میں اپنے اس اذعالی انداز گفتار پر معذرت خواہ ہوں۔ میں اپنی نوجوانی کے بعد سے اذعانیت اور اذعانیت (Dogmatism) کو ذہن کی فاشی سمجھتا ہوں۔

میرا استدلال یہ ہے کہ ڈراما خیال کو کردار میں متجسم کرنے کا فن ہے اور خیال کے کردار کی صورت میں متجسم اور مستحیل ہونے کا مطلب ہے، خیال کا اپنی توانگی کو ہوتا۔ خیال

ڈرامے کا ایک کردار بن کر ایک متعین مکان اور متعین زمان سے متعلق ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک کئی اور وسیع الاطلاق خیالیہ، جنئی مکان، جنئی زمان اور جنئی مظہریت میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

میں ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک صبح و شام ڈرامے میں غرق رہا اور اس کے ساتھ شاعری کا قدرے غیر مسلسل سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس میں انتخابی مقابلہ ہوا اور پورا معاشرہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ اسی وقت کے حالات کے پیش نظر بزمِ حق نمائے اپنے ڈراموں کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ اس لیے کہ ہندوستان کی تاریخ کے اسٹیج پر ان ڈراموں سے کہیں زیادہ، کہیں زیادہ سنسنی خیز ڈراما پیش ہونے والا تھا۔ اس کے زیر اثر میری ڈرامائی سرگرمیاں بھی ختم ہو گئیں۔ اس وقت سلمیٰ فضا پر سیاست کا بحران طاری تھا۔

آخر ملک تقسیم ہو گیا۔ چودھویں اور پندرہویں اگست کے بعد ایک یکسر نیا برصغیر وجود میں آیا۔ آزادی کا جشن منایا گیا مگر مجھے لاکھوں چراغوں کی روشنی میں اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ وہ آزادی نہیں تھی جس کے خواب میں نے دیکھے تھے۔ میں نے خون میں تھنڑی ہوئی اس آزادی کا اپنے ذہن کی بدترین حالت میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ ہم سب یہ سمجھتے تھے کہ آزادی کے بعد برصغیر جنت بن جائے گا لیکن حقیقت حل یہ تھی کہ ہم آزادی کے جنم میں جلنے کا ایک اشتعال انگیز دور شروع کر رہے تھے۔

میں اپنے مزاج میں شروع ہی سے ایک نفی پسند (Nihilist) اور فوضوی (Anarchist) تھا۔ میں کسی بھی ضابطے اور قاعدے کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی تھی کہ تمام ضابطے اور قاعدے انگریز سرکار اور اس کے وٹال جاگیرداروں، تعلقہ داروں، رائے صاحبوں، خان بہادروں اور سبک سر، سروں کو راس آتے تھے۔

میں نے تقسیم کے بعد ہی صحیح معنی میں شاعری شروع کی میں شاعری میں بابا اور اپنے فلسفی اور عربی کے استاد مولانا سید محمد عبادت صاحب کلیم امروہوی کا شاگرد ہوں۔ یہ زمانہ میرے سیاسی شعور کا عہد آغاز تھا۔ میں اس زمانے میں صبح سے شام تک بلا ناٹھ، بھائی چھتین (ناٹھ امروہوی) کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن امروہہ کے صدر رہے تھے اور مسلم لیگ کے بانی بازو سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک بہت روشن خیال اور انفل دوست آدمی تھے۔ ۱۹۳۸ء کے آغاز کی بات ہے کہ انہوں نے ایک کتاب پڑھی جو بھائی صادقین احمد (نامور مصور) کے نصاب میں داخل تھی۔ اس

کتاب کا نام تھا ”نئے ادبی رجحانات“ یہ کتاب پروفیسر احتشام حسین کے استاد، ڈاکٹر اعجاز حسین نے تالیف کی تھی۔ اس کتاب نے بھائی ناٹھ کو چند ہی روز میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اب وہ کیونزم کے راستے پر چلنے کی حالت میں آگے تھے۔ انہوں نے یہ کتاب مجھے پڑھنے کو دی اور صحیح بات یہ ہے کہ میں نے اس کتاب کے ذریعے ترقی پسند تحریک کی ادبی اور سیاسی معنویت سمجھی۔ بھائی چھتین نے اسی زمانے میں مجھے منطق کی پہلی کتاب پڑھائی اور میں جو شروع ہی سے فلسفے کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا، آہستہ آہستہ فلسفے کے راستے پر چل پڑا۔ اس وقت میرے تینوں بڑے بھائی پاکستان جا چکے تھے۔

سیاسیات میں بھائی ناٹھ ہی میرے استاد تھے۔ انہوں نے ہی مجھے کیونزم کا راستہ دکھایا۔ میں ایک مستحکم اور لاادری آدمی ہوں۔ مجھے اب اپنی کسی بات پر کوئی اصرار نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی رائے صحیح ہو اور میری غلط مگر جمل تک کیونزم کی سلامتی سائنس کا تعلق ہے، تو میں اس پر اپنی پوری استدلالی، شاعرانہ اور اخلاقی حائوں کے ساتھ یقین رکھتا ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ شرفائے تاریخ میں سے کوئی ہستی سرملیہ داری نظام کی تائید کرے گی۔ اگر حضرت عیسیٰ موجود ہوتے تو کیا وہ سرملیہ دارانہ نظام برداشت کر سکتے تھے؟ کیا آں حضرت اور ان کے برگزیدہ صحابہ کسی سرملیہ دار معاشرے میں ایک پلن بھی سانس لینا پسند کر سکتے تھے؟ اشتراکی معاشرہ شرفائے تاریخ کا خواب رہا ہے۔ میں ان دنوں اپنے ہر قول کو قول فیصل سمجھتا تھا۔ میرے اندر شدید ترین ادعاتیت (Dogmatism) اور لوعائیت پائی جاتی تھی۔ اسی دوران میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا جسے میں نے ایک غیر مستند اور یکسر ذاتی خیال سمجھا۔ وہ خیال یہ تھا کہ کئے کاروان ختم ہو جانا چاہیے۔ اس خیال کے زیر اثر میں نے ۱۹۳۹ء یا ۱۹۵۰ء میں ایک غزل کہی جس کے چند شعر یہ ہیں۔

کر نہ افسانہ عدم تازہ  
زلف ہستی ہے خم بہ خم تازہ  
کفر لیل حرم کی سازش ہے  
خدا بھی صنم صنم تازہ  
نغمہ گر اک نوائے بے تانوں  
ہونہ آئین زیر و بم تازہ

اس غزل کا جو شعر مجھے سنانا تھا، وہ یہ ہے

ہو جہاں زر نہ قیمتِ یوسف

کر وہ بازارِ بے درم تا

پرودھن نے بھی یہی کہا تھا کہ ہو جہاں زر نہ قیمتِ یوسف، کر وہ بازارِ بے درم تازہ۔ اس قدر استعمالی کو بقی رکھنے اور قدر مبادلہ کو درمیان سے ہٹانے کا نظریہ پیش کیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ فلسفے کے مطالعے میں غرق ہوتا جا رہا تھا۔ میری بد نصیبی کہ میں سب سے پہلے ایک برطانوی فلسفی سے دوچار ہوا۔ وہ تھا تصوریت پسند ہارکے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ہم شے اور اک اس لیے نہیں کرتے کہ وہ پائی جاتی ہے بلکہ وہ پائی ہی اس لیے جاتی ہے کہ ہم اس کا اور اک کرتے ہیں یعنی اگر ہم کسی کتب کو پڑھنے کے بعد الماری میں بند کر دیں اور وہ ہمارا معروض اور اک رہے تو وہ ایک سر محدود ہو جائے گی اور اس کا کائنات میں کہیں کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔ یہ کیا بہت دلچسپ صورت حال تھی اور میرا خیال پسند ذہن اس سے بے حد لطف اندوز ہوتا تھا لیکن اس لطف اندوزی کے باوجود میرا دماغ مختل ہو جاتا تھا۔ میں الماری کھولتا اور اس کتب کو انتہائی ناقابلِ جواز ط پر موجود پاتا اور پھر الماری بند کرتا یعنی اس کتب کو دوبارہ عدم کے حوالے کر دیتا۔ یہ تصور یہ پسندانہ مشقت میرے دماغ کے لیے ایک سر ناقابلِ برداشت تھی مگر ہارکے نے اپنی انتہائی نظریاتی فرا دلی کا ثبوت دے کر اسے میرے لیے کسی حد تک قابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ اس کا افادہ عالیہ یہ تھا جس وقت تم نے کتب رکھ کر الماری بند کر دی تھی اور وہ کتب کسی انسان کے اور اک کا معروض ہونے کی وجہ سے محدود ہو گئی تھی اس وقت وہ ذہن باری میں موجود تھی۔

میں طلسم ہوش ربا، کوچک بانتر، بلا بانتر اور بوستان خیال کی تمام جلدیں پڑھ لینے کے باوجود ہارکے مقدس تصوریت پسندانہ شعبہ گری اور کتب کے بے یک آن موجود اور بے یک آن محدود ہو جا کے وقوع سے محفوظ ہونے کا ذرا بھی اہل نہ تھا۔ آخر مجھے ڈیوڈ ہیوم کی ”مبادی علم انسانی“ پڑھنا موقع ملا۔

ہیوم کو پڑھنے کا مشورہ مجھے دہلی میں مشہور کیونٹ مفکر اور ترقی پسند ادیب ڈاکٹر عبد العظیم دیا تھا۔ میں دنیا کا تو پہلے بھی نہیں تھا۔ یہ کتب پڑھ کر دین سے بھی گیا۔ جس حکمت عملی کے سا ہارکے نے نازے کا خانہ خراب کیا تھا، اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ منصوبہ بندی کے ساتھ ہیوم نے ذہن نفس روح اور ان کی کہیں گاہیں برباد کیں۔

اس نے ایک اور ہنر بھی دکھایا اور وہ تھا، نظامِ علیت کو بے بنیاد ثابت کرنے کا ہنر۔ یہ

ہیوم سے بہت پہلے ہمارے علم الکلامی خانوادے کے قبلہ و کعبہ امام غزالی بھی دکھا چکے تھے۔ ہیوم نے عقل کو اس کی مستند اقدار سے معزول نہیں کیا تھا مگر میرے بزرگ محترم امام غزالی نے اس مقدس اور شہرک عمل کی تکمیل کا مطبوع عام اور مقبول عوام فرض بھی انجام دیا جس کا حضرت ابو موسیٰ اشعری کے پوتے امام ابو الحسن اشعری کی عمر کی چوتھی دہائی سے دنیائے اسلام کو بڑی شدت ..... سے انتظار تھا۔

مازے، روح اور ذہن کی اس تباہی کے بعد میں ایک جاں کاہر تباہیت میں مبتلا ہو گیا۔ میری زعانت اور اعلیٰ ترین انجام سے دوچار ہوئی تھی۔ لب ایک بیزار کن ٹھنک تھا، محلے کی ایک لڑکی بلکہ محلے اور شہر کی کتنی ہی لڑکیوں کے شوق اور اس شوق کے اظہار نہ کرنے کی اذیت تھی اور گھروں، گلیوں اور محلوں کے خوش ترتیبی کے ساتھ ویران ہونے کی مسلسل وقوع پذیری تھی اور میں تھا۔

ساری گلی سنسن پڑی تھی باؤ فنا کے پہرے میں گھر کے دالان اور آنگن میں بس اک سلیہ زندہ تھا اس اداسی میں تحصیل علم اور تہذیبی سرگرمیاں تھیں جو وقت گزارنے کی مشقت کا احساس کچھ کم کر دیتی تھیں۔ میں نے اب تک دو قسم کی انفعالیات میں زندگی گزارنی تھی۔ ایک باعد الطبیعیاتی انفعالیات اور دوسری تاریخیاتی انفعالیات۔ باعد الطبیعیاتی انفعالیات کی آرام دہ کیفیت سے اب میرا بہن محروم ہوتا جا رہا تھا۔ مغربی اور ”یونانی“ فلسفے کے منطقی نتائج نے مجھے ارسطو کے محرک اول (Prime Mover) اور عربی فلسفے کی اصطلاح کے مطابق واجب الوجود کی عقلی اور جذباتی ڈاؤنری سے مستفید ہونے کا کسی درجے میں بھی اہل نہیں رکھا تھا۔

ذہنی صورت حل بہت نامساز گار ہو گئی تھی اور مجھے اپنے شہر کے جنگل اور بلغ اب اچھے نہیں لگتے تھے۔ موسم گرما کی تدریک راتوں کا گھنا آسمن، اب میرے لیے خیال آفریں نہیں رہا تھا پڑنا گور۔ ... سے کسی نے سوال کیا تھا کہ خدا کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا تھا کہ سلسلہ بہت پیچیدہ ہے اور عمر بہت کم۔

اس طرف زلف تاز پڑخم ہے اور ادھر اپنی زندگی کم ہے

میرا سب سے بڑا مسئلہ یقین سے محروم ہوجانے کی اذیت سے تعلق رکھتا تھا۔ اربابیت میرے نزدیک ہرگز کوئی خوش آئند کیفیت نہیں تھی لیکن والٹیر کے قول کے مطابق یقین انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ اگر بھی مجھے اپنی بے آرائی کی حالت میں ”مضحکہ خیز یقین“ کی اکسیر استعمال کرنے پر کوئی اعتراض

نہیں تھا مگر صورت واقعہ یہ تھی کہ یہ اسی فلسفے کے پسندوں کے ہاں ملتی تھی اور میں ایک بلدیاتی شے کے لیے دکان دکان جا کر اپنی حیثیت عرفی زائل کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ مسئلہ کلیتاً کائناتی تھا اور بیکن کے قول کے مطابق اتنا پیچیدہ تھا کہ منطقی قیاس کے قابو میں نہیں آسکتا تھا۔ کائنات کی مابعد الطبیعی توجیہ کی تھی اور کائنات نے صحیح کہا تھا کہ مابعد الطبیعی امور کو منطقی اور کے ذریعے ثابت نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ مذہب اور خدا عقل کی دست رس سے باہر ہیں۔ یہ شدید اریٹائیت کے باوجود یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کو ارض بلکہ ہماری اس کمکشاں کے کسی بھی پر کسی ایسے ذہن کا وجود فرض کرنا ممکن نہیں جو لفظ خدا کے مفہوم کی تشریح کر سکے۔ مسئلہ سیلابیا حسی ایجنسی کی رضامندی یا ندرضامندی کا نہیں ہے۔ مسئلہ عقل کے خاواوے کی جتہ عالیہ اور جتہ عالی تفسیر کا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم یہ مسئلہ اس دانش کے سامنے لے جائیں جو ابارے میں کوئی حتمی فیصلہ دینے کا سب سے زیادہ استحقاق رکھتی ہے۔ یہاں میں سب سے الہیات کے ”ماہر خصوصی“ مسسٹی پلوئی نس کا نام لوں گا جس نے کسی بھی مشقت کے بغیر فلسفے کے خراج پر شاعری کی۔ اس بزرگ کا قول ہے کہ خدا کے بارے میں یہ کہنا بھی روانہ ہو مود ہے۔ وہ تو وجود سے بھی برتر اور بلور ہے وہ برترین تخریب ہے۔ حضرت علی نے صفات کی تلقین کی ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کمال الاخلاص لہ نفی الصفات یعنی تخریبہ کا ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے اس لیے کہ ہر صفت شہد ہے کہ وہ اپنے موصوف سے اور ہر موصوف شہد ہے کہ وہ اپنی صفت سے جدا گانہ کوئی وجود رکھتا ہے لہذا جس نے ذات صفات نہیں اس نے ذات کا ایک قرین فرض کر لیا اور اس طرح ثنویت پیدا کی۔ فلسفیانہ تصور نمائندوں نے بھی یہی موقف اختیار کیا اور کہا کہ خدا الیس اور لیس سے منزہ ہے۔ یہاں میں خطبات کی طرف بھی اشارہ کروں گا۔ موجود کا مطلب ہے، ارسطو کے دس مقولات، کائنات مقولات اور ہیگل کے (شاید) ستر مقولات میں محدود ہو جانا۔ دنیا کے کسی فلسفے نے میرے مطابق آج تک وجود اور موجود کی تعریف کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ ہم لغوی اور نصابی وجود کی ایک ہی تعریف کر سکتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وجود کا ایک ہی مترادف بیان کر اور وہ ہے ہابیت کا خارج میں ہونا۔ میں اپنے فلسفیانہ مطالعے، یقیناً بچہ محدود مطالعے کے کہہ سکتا ہوں کہ وجود کی اس کے سوا آج تک کوئی توجیہ نہیں کی جاسکی۔ جب ہم یہ کہتے؟

موجود ہے تو ہم اسے ایک ہابیت قرار دیتے ہیں۔ ہم گفتگو آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر موجود شے ہے اور ہر شے موجود ہے۔ شیبیت اور وجود ہم معنی ہیں۔ اب ہم کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا شے ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے تو پھر اس کا، ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ خدا لاشے ہے۔ لاشے کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، ایک لاموجود اور ایک یہ کہ وہ موجود جو شے نہ ہو، کچھ اور ہو۔ کچھ اور کیا؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب مابعد الطبیعی فکر کے تمام نمائندوں کو دینا ہے۔

فلسفہ وجود اور وجود وجود سے بحث کرتا ہے اور سائنس مظاہر وجود سے بحث کرتی ہے۔ میں نے جس کائنات میں آنکھ کھولی تھی، وہ موجودہ کائنات سے یک سر مختلف کائنات تھی، ایک ایسی کائنات جو بہ یک وقت ارسطو کی کائنات بھی تھی اور ..... اور دیمقراطیس کی کائنات بھی۔ ہمارے اردو کے علمی ماحول میں دو مسئلے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ خدا موجود ہے یا نہیں؟ اور دوسرا مسئلہ سیاست سے تعلق رکھتا تھا۔ یہاں دو سوال پیدا ہوتے تھے۔ ایک یہ کہ آیا مغربی جمہوریت سب سے زیادہ انسانی نواز نظام ہے یا کمیونزم؟ یہ سوال آزادی سے پہلے بھی زیر بحث رہتا تھا اور آزادی کے بعد بھی دو تین سال تک ہمارے شہر کا موضوع رہا۔ یہاں مجھے اردو کے سب سے مشہور کیورنٹ اور سب سے گنہگار اور اپنے بھائی سید محمد تقی کے انقلابی ساتھی کامریڈ مصور حسین یاد آرہے ہیں اور ان کی یاد کے ساتھ مجھے اپنے بچپن یا لڑکپن کی ایک محفل نصت یاد آ رہی ہے، وہ محفل طرحی تھی، اس کی زمین تھی مفاعیلن فعلاتن گلاب شیشے میں، شب شیشے میں۔ اس محفل میں بھائی مصور، انقلابی لڑکوں کی پیلری تپ دق میں خون تھوکنے والے بھائی مصور نے جو نصت پڑھی تھی، اس کا ایک شعر مجھے لڑکپن سے یاد چلا آ رہا ہے۔

جو خاک خورم ہوئی تھی یہ روز عاشورا

وہ رکھ گئے تھے رسالت باب شیشے میں  
میں نے اپنے ناقص مطالعے اور علمی مجلسوں کے اقلوے کے نتیجے میں جو بات سیکھی، وہ یہ ہے کہ دلیل دلیل شاید کچھ نہیں، وہ تو ایک تاریخی، سماجی اور نفسیاتی تکلیف (CONDITIONING) ہوتی ہے جو کسی راءے اور مسلک کو اختیار کرنے کا رجحان پیدا کرتی ہے۔ دلیلیں تو سب وہی ہیں مگر کوئی بیرونی ہے، کوئی مسیحی ہے، کوئی مسلمان ہے، کوئی ہندو ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ کائنات کی ایک

عزت شاعرہ پائی جاتی ہے اور کوئی اس سے انکار کرتا ہے۔ میرا گلن یہ ہے کہ کسی عالمی نظام استدلال اور عالمی منطق کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ اگر ہم اعتراف کی شرفیادہ ملاحظہ رکھتے ہوں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ہم جو اب حاصل کرنا توڑی بات ہے، سوال کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ ہم کائنات کے بارے میں جو بنیادی اور جوہری سوالات اٹھا سکتے ہیں، وہ غالباً یہ ہیں کہ کائنات کی ہدایت، ماہیت حقیقت اور غایتِ قصویٰ کیا ہے؟ کیا یہ ہلکی انتہائی بد نصیبی نہیں ہے کہ ہمارے اس نوع کے تمام سوالات صرف ناجواب پذیر ہی نہیں، ناقابل توجیح اور ناقابل تشریح بھی ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں آپ فلسفی ہوں یا طبیعتی سائنس دان، کیا آپ ان سوالات کی تشریح کر سکتے ہیں..... یہاں منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ منطقی اثباتیت، مارکس اور طبیعتی نوعیت کے مفہیم کو ”مفہیم“ کی حیثیت دینے سے اپنے آپ کو معذور محسوس کرتا ہے۔ میرا گلن ہے کہ یہ ان کا کوئی فکری مکابرہ نہیں ہے۔ وہ لہنا یہ نقطہ نظر پیش کر کے اپنے تئیں مغرب اور مشرق کے فلسفیانہ حلقوں کو ایک ”اشتعل انگیز بشارت“ دینے کی لذت سے حظ اٹھانے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس باب میں وہ حق بہ جانب ہیں۔

صورت مسئلہ یہ ہے کہ ماوراء الطبیعی اور نیم ماوراء الطبیعی سوالات سے تعلق رکھنے والے جملے صرف و نحو کے اعتبار سے تو ضرور درست ہوتے ہیں۔ مگر وہ مفہوم سے کوئی تماس اور تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً حسب ذیل جملے۔

۱۔ دہر میں قبل اور بعد نہیں پائے جاتے۔

۲۔ وجود ایک بسیط حقیقت ہے۔

۳۔ اعیان علیت، اعیان ممکنات کے وہ حقائق ہیں جو علم حق میں ثبوت رکھتے ہیں۔

ان تین جملوں میں شروع کے دو جملے مابعد الطبیعیات سے تعلق رکھتے ہیں اور تیسرا فلسفیانہ تصوف کی نمائندگی کرتا ہے۔

میں فلسفے کا مطالعہ کرنے کے نتیجے میں اپنی تمام تر یقینات سے محروم ہو گیا۔ اس کے

یہ کیفیت ہوئی کہ اگر ایک زاویہ قائمہ دو حادثہ زلیلوں کے برابر ہوتا ہے تو ہوا کرے، میری بنا ہے۔ اس دوران میں اس نتیجے تک پہنچا کہ کائنات کی کوئی ایک توجیہ کرنا شاید ناگزیر نہیں ہے یا شاید ہی یہ خواہش تھی کہ ناگزیر نہیں ہونا چاہیے۔ میں سوچتا رہتا ہوں اور محض سوچنے کے لیے نہیں بلکہ ی نتیجے تک پہنچنے کے لیے۔ میں اب تک جس نتیجے تک پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ کائنات کی تمام شےیں و نیا دراصل ”واقعات“ ہیں جو ممکن و زمین کے منطقی انقسلت میں متصلاً پیش آرہے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کائنات ایک واقعہ ہے جو عظیم الشان پیمانے پر متصلاً پیش آرہا ہے۔ وہ شے جو زمینی اور ممکن اور پر واقع نہ ہو یا پیش نہ آئے، غیر موجود ہوتی ہے۔ خدا زمینی یا ممکن طور پر واقع نہیں ہوتا یا پیش میں آتا اس لیے وہ غیر موجود ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ کس مسلمان مفکر نے یہ بات کہی ہے کہ خدا کو ”موجود“ کہنا اس کی تزیینہ کے ایک سربرخلاف ہے۔ موجود مفعول کا صیغہ ہے اور خدا کے لیے مفعول کا صیغہ استعمال کرنا بدترین مشرکانه جملت ہے۔

تقریباً تین ہزار یا ساڑھے تین ہزار برس سے مذہب ملکوں اور معاشروں میں یہ رجحان عام رہا ہے کہ کائنات کی اور کائنات کے مظاہر کی کوئی ایک توجیہ کی جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا..... کہ کائنات اور کائنات کے مظاہر کی کوئی ایک توجیہ کرنا کیوں ضروری ہے؟ ایک اور مسئلہ بھی مجھے بہت پریشان کرتا ہے کہ کائنات کی کوئی غایت ہے یا نہیں؟ میں اکثر سوچتا ہوں کہ لرسطو اور ہٹلر کے پیدا ہونے کی آخر کیا غایت تھی؟ اگر ہالیا شیل کے بجائے جنوب میں واقع ہوتا تو اس میں آخر کیا استحکام تھا؟ اگر انسانی نطفہ کے اوپر ہلوں کی لکیر نہ پائی جلتی تو آخر کس نظامیت بدنی کو نقصان پہنچ جاتا؟ میں نے اپنی بعض محبوبت کی پندلیوں پر ہلوں کی جھلک دیکھی ہے۔ اور بعض کی پندلیاں بالکل صاف پائی ہیں۔ بعض محبوبت کا پیمانہ نطفہ گرا پایا ہے اور بعض کا اٹھلا۔ میں شاعر عاشق اور معشوق کے طور پر ان مظاہر کی توجیہ کرنے کا قطعاً ذمے دار نہیں ہوں مگر ایک سوچنے والے غیر چندنیاتی فرد کے طور پر میں یہ سوال کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ اس بے نظامی کو کس نظام کا نتیجہ قرار دیا جائے؟

تضاد اشیا کی حقیقت اور ان کا عین ہے مگر کائنات باطن اور ظاہر میں منقسم نہیں ہے۔ کائنات کا نہ کوئی اندر ہے اور نہ کوئی بیرون۔ کائنات کی خلدی صورت ہی کائنات ہے۔ کائنات ایک دائم اور سرمدی برہنگی کا نام ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو فلسفے اور شاعری میں مشترک ہیں لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ فلسفے کے تمام مسائل شاعری کے مسائل ہیں لیکن شاعری کے تمام مسائل فلسفے کے

مقبرے کے مغربی جبب دفن ہوئے۔

مصنف ہفتے عشرے بعد ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ وہ اپنے ”مذکرہ ہندی گویاں“ میں لکھتے

”میرسید عبدالرسول نیک مردست جہل دیدہ و فمیدہ۔ اصلش از اکبر آبادست۔

فقیر اور اور ابتدائے شاعری در قصبہ امر وہ دیدہ بود۔ اکثر بعد ہفتہ و عشرہ ملاقات و

مذکرہ شعر بہ میں می آمد۔“

خاص اسلوب کلام کے علاوہ دوسرے اسلوب کلام یعنی نثر کا اعلیٰ تخلیقی نمونہ بھی شاعری ہی کی ایک صنف ہوتا ہے تو ہم ایسا غوجی کا پڑھا ہوا سلا سبق بھول جاتے ہیں۔ ہمارے منطقی شعور کو ایک جھٹکا لگتا ہے اور منطقی تعریفیات کی تمام تر منہاجیات Methodology بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ مسئلہ اخلاقی اس لیے ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان یہ معاملہ ہے کہ ہم افلاطون، ڈامسٹھینز، قس ابن سلحد، بدیع الزماں ہمدانی، گلستاں کے سعدی، آسکر والٹز اور میرامن کو بہترین شاعر کہہ کر یاد نہیں کریں گے بلکہ انہیں اعلیٰ ادیب کہیں گے۔ اگر میں کل سے یہ کہنے لگوں کہ بلائے واستود سکی، رتن ناتھ سرشد، پریم چند اور مننو بہترین شاعر تھے تو میں سمجھ سکتا کہ پھر ہمارے اور آپ کے درمیان کس طرح گفتگو ہو سکے گی۔ اور اگر آپ کوئی خاتون ہیں تو میرے اور آپ کے درمیان جو سلسلہ جاری ہے وہ آئندہ کس طرح جاری رہ سکے گا۔ یہ مسئلہ اس لیے بھی اخلاقی ہے کہ ہم کوئی اچھی یا بُری غزل یا نظم سنا کر آپ سے کبھی اس بات کی خواہش نہیں رکھتے کہ آپ ہمیں بہترین ادیب یا افسانہ نگار کہیں۔ پھر آپ یہ کیوں چاہتے ہیں۔ آپ جو عمومی طور پر بری بھونڈی اور غلط نثر لکھ رہے ہیں کہ ہم آپ کو شاعر کہیں۔

میرا خیال ہے کہ مجھے اس مناظرے کو چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہیے۔ میں انتہائی مصالحت پسندانہ جذبے کے ساتھ یہ پوچھوں گا کہ ہم دن بھر اپنے گھروں، راستوں، گھڑیوں، دفنوں، کلہ خاتون اور مختلف اداروں میں ایک دوسرے سے کس اسلوب میں گفتگو کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نثر میں۔ اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم میں سے اگر کچھ لوگ، کچھ اول جلیل لوگ ایک غیر معمولی کیفیت میں اپنے آپ سے اور دوسروں سے ایک مخصوص فنی آہنگ میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو آپ اس گفتگو کو ایک خاص اصطلاحی نام دینے میں کیا خرابی محسوس کرتے ہیں؟ میں بہت ہی سرسری انداز میں اس طرز گفتگو کو شاعری کہتا ہوں۔

جب ایک تربیت یافتہ ذہن اور ذوق رکھنے والا آدمی اپنی روز مرہ کی مصروفیت اور فوری ضرورتوں کے احساس سے بلند ہو کر اپنے ساتھ تنہا ہو جاتا ہے اور اپنے مسکوت کو اپنے ہی لفظوں میں گنگناہ لگاتا ہے تو وہ شاعری کر رہا ہوتا ہے۔ فنون یعنی شاعری، مصوری، افسانہ نگاری اور مجسمہ سازی اس بات کا مظہر ہیں کہ فطرت نے اپنے آپ سے بلند ہونا چاہا ہے۔ میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ فن صاحب فن کے ترغیب ذات کی تربیت یافتہ اور برجستہ خواہش کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔ میں محبت اور شاعری کو بھی مذکورہ صورت حال کے ساتھ توسیع ذات ہی سے تعبیر کروں گا۔

میں نے ”ذات“ کا لفظ استعمال کیا ہے اور میں اچانک چوکتا ہو گیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ”ذات“ ایک بہت ہی عامیانہ، وجودی، غیر ذمہ دارانہ اور امریکی ”فکریات“ کی ریسٹورانے اصطلاح

جب میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے گھر میں صبح سے شام تک شاعری، تاریخ، ذ عالم، علم ہیئت (ASTRONOMY) اور فلسفے کا دفتر کھلا دیکھا اور بحث مباحث کا ہنگامہ گرم اس تمام سرگرمی کا مرکز ہمارے بابا علامہ سید شفیق حسن الیما تھے۔ وہ کئی علوم کے جامع تھے اور زبانیں جانتے تھے یعنی عربی، انگریزی، فارسی، عبرانی اور سنسکرت۔ وہ صبح سے شام تک لکھتے رہتے اور تقریباً اس یقین کے ساتھ کہ ان کا لکھا، چھپے گا نہیں۔ علم ہیئت سے انہیں خاص شغف تھا؛ کے مسائل سے متعلق رصد گاہ گرینچ (Green Wich Observatory) انگلستان کے علاہ باہرن، برٹینڈرسل اور جنوبی ایشیا کی ایک رصد گاہ کے ڈائریکٹر زریان سے ان کی خط و کتابت ہوتی تھی۔ وہ تعینف و تالیف کی دلچسپ مشقت سے چون بچیں برس تک محفوظ ہوتے رہے۔

وہ قلم ہی کے نہیں، موقلم کے بھی آدمی تھے۔ ہیئت کے نقشوں کے علاوہ انہوں نے امام حسینؑ سفر کر بلا کی منزلوں اور کر بلا کے میدان واقعہ کے نقشے بھی بنائے تھے۔ ان نقشوں میں تاریخ اور مذہب کے سیکڑوں حوالے پیش کیے گئے ہیں۔ مشہور مصور اقبال ممدی جو میرا بھتیجا ہوتا ہے، موقلم کے میں بابا کا واحد وارث ہے۔ بابا نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنے موقلم اور دوسری متعلقہ؛ لائن (اقبل ممدی) ہی کو دی تھیں۔ دانے کے بعد بابا شاید وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے کانا، نواجی اور ضواجی سے معاملت رکھنے کا فنی ثبوت فراہم کیا تھا۔ انہوں نے جنت اور جہنم کا ایک نقشہ تھا۔ اس نقشے میں انہوں نے اپنے وجود کے باطن باطن اور کاسن کے جمال و جلال کو احساس آگینی کے ساتھ پیش کیا تھا۔ انہوں نے جنت میں اپنی ذات ذات اور صفات صفات کے رؤوف اور عطف رنگ کھپا دیے ہیں۔ اب رہا جہنم، تو جہنم میں انہوں نے بے حد جارحانہ، سفاک و پینائی سوز رنگ استعمال کیے ہیں اور ان کی تدریجات (Shades) اور ان تدریجات کی طوی و اضافتوں کے ذریعے نقشے میں ایک عجب شدیدیت پیدا کر دی ہے۔ ان کے تمام جاننے والے جانتے کہ انہوں نے زندگی میں کبھی ایک بار بھی غصہ نہیں کیا۔ مگر میرا خیال ہے کہ انہوں نے زندگی میں بار ضرور غصہ کیا تھا اور وہ جہنم ہی کا غصہ تھا۔



بن کر رہ گئی ہے اس لیے میں اسے احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ ذات معاشی اور معاشرتیوں کے درمیان، فرد کے شعوری، غیر شعوری، فعلی اور انفعالی شخص کی متعین اور متحرک حالت نام ہے۔

شاعری ذات میں فطرت کے ارتقاء کا جمالیاتی بروز ہوتا ہے۔ یہاں شاعر سے ایک ایسا تہ مراد ہے جس کے نفس میں احساس، تخیل، تعقل اور جذبہ ہم آہنگ ہو کر ایک تخلیقی وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور یہ تخلیقی وحدت، باطنی صوتی وحدتوں (لفظوں) کی غنائی تالیفات میں صورت پذیر ہو کر شاعری کہلاتی ہے۔ یہاں ایک خاص بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ ریاضیات کو عامہ پر تمام فنون لطیفہ اور خاص طور پر شاعری کی ناگوار ترین ضد سمجھا جاتا ہے۔ میں نے بھی طالب علم ابتدائی زمانے میں یہی سمجھا تھا سو مل کھا گیا۔ فنون لطیفہ کی انتہائی لطیف، مجرد اور نمایندہ ترین موسیقی، ریاضیات ہی کی ایک قسم ہے۔ میرے خیال میں افسانہ نگاری اور ڈرامے کو چھوڑ کر فنون کی تمام اقسام، ریاضیات ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ شاعری کلام موزوں کی حیثیت سے شعوری طور پر ریاضیات کا ایک شعبہ ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاعری ذہن کی موسیقی ہے اور اس کے آلات ہیں۔

اب رہا خیال یا شعر کا موضوع، تو اس سلسلے میں منطق کا ذکر ناگزیر ہے، منطق شاعری اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ کسی بھی حالت میں۔ اور شعور منطق کے اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ غرض کسی بھی حالت میں۔ یہ گفتگو اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے معاشرے میں بلکہ تمام معاشروں میں شروع ہو شاعری کو الہام یا کائنات سمجھا گیا ہے۔ شاعری کا تعلق اگر پیڑ اور پنڈے سے نہیں ہے بلکہ دماغ ہے، ذہن سے ہے تو ذہن کی سب سے اعلیٰ حالت یعنی منطقی حالت کا ذکر ناگزیر ہے۔

منطق جب انتہا اور استنتاج کے متدرج عمل میں غیر متدرج ہو جائے تو باعد الطبع وجود میں آتی ہے۔ منطق جب انتہا اور استنتاج کے استخراجی اور استقرائی عمل میں متدرج رہ سانس وجود میں آتی ہے۔ اور منطق جب احساس کی مکانیت اور زمانیت میں تخیل اور جذبہ جمالیاتی آہنگ کے ساتھ صورت پذیر ہو تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ یعنی شاعری کے چل چل ہیں تعقل، احساس، تخیل اور جذبہ۔ جب کہ سانس بلا واسطہ اور بالواسطہ طور پر صرف احساس تعلق رکھتی ہے مذہب تخیل سے تعلق رکھتا ہے، فلسفہ صرف تعقل سے تعلق رکھتا ہے اور احساس، تخیل، تعقل اور جذبہ (چاروں عناصر) کی جامع ہے۔

یہاں یہ بات بھی کسی جگہ چاہیے کہ اگر ہمارے شعور کا حقیقت سے طویل رشتہ ہو تو تازہ اور مذہب وجود میں آتے ہیں۔ اگر عرضی رشتہ ہو تو سائنسی علوم وجود میں آتے ہیں اور اگر

شعور بھی ہو اور اس رشتے پر مستقبل کا پرتو پڑ رہا ہو تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ شاعری ہی وہ فن ہے واپسی، حل اور مستقبل تینوں کو ہم عصر بناتا ہے۔ ذہن کی یہ خلاف معمول اور غیر معمولی طور پذیری در طور پروازی ذہن کے مذہب ترین اختلال اور دانش مندانہ جنون کا نتیجہ ہوتی ہے، شاعری میں ذہن وہ خلاف معمول فعلیت اختیار کرتا ہے جو احساس، تخیل اور تعقل کی باہمی اضافتوں کے تناسب میں اس کی طرف سے (زقند) کی حیثیت رکھتی ہے جسے جذبے کی کیفیت اور گیت کا آہنگ حاصل

و۔

شاعری ایک دوہرا انسان چاہتی ہے جو حقیقت سے عقل اور جذبے کے ساتھ ابدی معاملت رکھتا ہو۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاعری ایک واقعے کو چار آنکھوں سے دیکھنے اور ایک کیفیت کو روزہنوں سے محسوس کرنے کا عمل ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر ایک خاص فن کے نمائندے کی حیثیت سے مظاہر اور معانی اور ان کی مجموعیت کو کس معیار کی نسبت سے زد اور قبول کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اپنی پوری شعوری تربیت کے ساتھ جذبے کی نسبت سے۔ اس لیے کہ وہ احساس، تخیل اور تعقل کے دائروں سے گزر چکا ہوتا ہے اور آخر میں ایک ہی دائرہ رہ جاتا ہے جہاں وہ اپنا شخص حاصل کرتا ہے اور اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

اس مرحلے پر اس کے کردار کی نوعیت کے بدلے میں سوال اٹھانا مناسب ہو گا۔ یعنی کیا اس کے کردار کی نوعیت اخلاقی ہوتی ہے یا جمالیاتی؟ اس موقع پر یہ سوال بالکل منطقی ہے۔

اس سوال کا میں یہ جواب دینا چاہتا ہوں کہ اس کے کردار کی نوعیت اخلاقی ہوتی ہے۔ اور یہ وہ جواب ہے جس کی کم سے کم مجھ سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہاں میں اس بات کا یقین بھی دلا دوں کہ میں اپنے قاری کو چونکانے کا ادنیٰ سے ادنیٰ رجحان بھی نہیں رکھتا۔ میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فن کے تعلق سے ہر وہ اخلاقیات جو جمالیات کے مفہوم سے کم یا زیادہ مفہوم رکھتی ہو وہ اخلاقیات نہیں ہوتی بلکہ عقیدہ ہوتی ہے۔ اور عقیدوں کا حسن اور فن سے کوئی غیر مشروط تعلق نہیں ہوتا۔ میں ایک شاعر کی حیثیت سے عقیدوں کی مجموعیت کو رد کرتا ہوں۔ عقیدوں کے نظام غیر مشروط حسن، خیر اور فن سے تضاد کی نسبت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ”با بعد الطبیعی حقائق“ کے شاعر، شاعر سے بلند تر مرتبے کے حقدار تو ہو سکتے ہیں مگر شاعر نہیں ہو سکتے اس لیے کہ شاعر کا سب سے گہرا رشتہ ”جمال“ سے ہوتا ہے اور جمال غیر زمینی اور غیر مکانی نہیں ہوتا۔

شاعرانہ حقیقت با بعد الطبیعی اور محض ذہنی نہیں ہوتی۔ کوئی اصل شاعر محض کسی خیال اور ”مثال“ کے لیے، شب بیداری، خود آزاری اور آخر شکاری سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ شاعرانہ حقیقت بلکہ تخلیقی حقیقت اپنی جوہریت میں ”غیر ذہنی“ اور خلدی ہوتی ہے۔ اور خود شاعر کا وجود اس کے

ذہن کے باہر یا جاتا ہے۔ حقیقت اگر پائی جاتی ہے تو اس کے دو طور نہیں ہیں یعنی خلدی اور بلکہ ایک ہی طور ہے جو خلدی بھی ہے اور ذہنی بھی۔ اور ذہنی بھی اس لیے ہے کہ خلدی ہے۔ بیرون ذات کی اور ذہن، بیرون ذہن کی پیداوار ہے۔ علم کا ذریعہ صرف حواس ہیں اور حکم کا صرف ذہن کو حاصل ہے جو حواس کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہاں میں نے حیثیت کا سوچنے کے بعد استعمال کیا ہے۔ وجدان کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اور شاید وجدان کے تو کچھ بھی آئیں مگر اردو میں ”برگساں“ کے کوئی معنی نہیں۔

ہم اپنے اندر نہیں سوچتے، ہم اپنے باہر سوچتے ہیں۔ ہم اپنے اندر سوچ ہی نہیں سکتے زبان کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اور زبان صرف خلد ہی کی نہیں بلکہ سلج اور سماجی رشتوں کا ہے۔ فرد کے انفرادی وجود تک جو شے صرف آواز تھی، اس نے جب اجتماعی اعتبار پایا، تو گئی۔

سچا شاعر کلیت ہونے کے لیے صرف ایک گواہی کی ضرورت ہے اور یہ گواہی اسی وقت ہوتی ہے جب اپنی ذات کو بیرون ذات سے دیکھا، پرکھا اور محسوس کیا جائے۔

ہلے گھر کے درو دیوار جس بحر پر صبح و شام جھومنا کرتے تھے، وہ بحر تھی، رجز مشن مخبون۔ یہ بحر ہلے گھر کے دالانوں کدوں کیلروں، زینوں اور صحنوں میں آپ ہی آر کرتی تھی۔ اس بحر میں مرزا سورانے ایک بہت اچھی غزل کہی تھی مگر وہ ہلے اترنیسی تجربہ نہیں ہلے گھر کی فضا تو سیدہ طاہرہ قرۃ العین کی غزل پر مرتقش ہوئی جو اس بحر میں کسی گئی تھی

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو  
شرح غم وفا کنم نکتہ بہ نکتہ مُو بہ مُو

بہا اس غزل کے بحر میں جتلارہا کرتے تھے۔ جبکہ انہیں اس بحر میں غزل کہنے والی نہ نفرت کرنی چاہیے تھی اس لیے کہ اس خاتون نے بہا کا آبائی مذہب چھوڑ کر ایک نئے مذہب پہنچائی تھی۔ ہلے بے حد مذہبی بہا قرۃ العین طاہرہ سے شدید عقیدت رکھتے تھے۔ سیدہ طاہرہ سیدائی بھی تھیں اور شیعہ بھی، مگر بعد کو انھوں نے شیعہ مذہب میں شکاف ڈال کر ایک کی تبلیغ میں تاریخی کردار ادا کیا لیکن بہا بہت مذہبی ہونے کے باوجود شاعری کے معاملے میں مذہبی تھے۔

یہاں سیدہ طاہرہ کی خاص بحر میں بہا کے دو شعر یاد آرہے ہیں۔

آپ حریم ناز میں شوق سے آئیں بے حجب  
اب وہ مجنوں مجنوں نہیں اب وہ نظر نظر نہیں

دوسرا شعر منقبت کا ہے۔

روئے حسن رخ حسین جلوہ طراز مشرقین  
غازہ بہ غازہ خط بہ خط دیدہ بہ دیدہ رُو بہ رُو

بلا کے ذریعہ یہ بحر مجھ پر بہت طلی رہی ہے۔ یہ بحر مجھ میں زمین و مکان کے احساس کی ایک تخلیق انگیز

نیت پیدا کر دیتی تھی۔ میں بھی اس بحر میں کلام کرنا چاہتا تھا مگر اس وقت میں اس اہلیت سے محروم تھا۔ اس زمانے میں شاعری کے تین نمایاں مکاتب سرگرم تھے۔ ملی شاعری، قوم پرستانہ انقلابی امیری اور سکہ بند غزل کی شاعری۔ علامہ اقبال ملی شاعری کے اتق پر چھائے ہوئے تھے۔ شاعر انقلاب حضرت جوش لیلچ آبادی قوم پرستانہ انقلابی شاعری کے سب سے بلا قامت اور برومند شاعر تھے اور جگر صاحب، علامہ آرزو لکھنوی، یاس یگانہ چنگیزی اور فراق صاحب غزل، جمل آشوب غزل کے سب سے محبوب نمایندے تھے۔

اب میں اپنی گفتگو اختتام تک پہنچانا چاہتا ہوں مگر ابھی کچھ باتیں باقی ہیں جن کا بیان ضروری ہے۔ ہم دانے کا اعتراف و احترام کرنے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے۔ جبکہ اس نے آن حضرت اور حضرت علیؑ کی شان میں شدید گستاخی کی تھی۔ ہم ڈارون اور لیڈرک کے نظریے ارتقا پر گفتگو کرتے اور اس پر لکھتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ نظریہ مذہب کے خلاف ہے۔ ہم فرانڈ کے جنسی نظریے پر اظہار خیل کرتے ہوئے اپنے آپ کو بالکل محفوظ پاتے ہیں جب کہ اس نظریے کے مطابق ایک بچے کا منہ میں چسنی لینا اور اسے چوستے رہنا اور ایک بوڑھے کا کسی مقدس شے کو بوسہ دینا، ان دونوں کا محرک جنس ہے۔ اور مندرے اور گنبد جنہیں ہم مقدس حیثیت دیتے آئے ہیں، جنس کی علامتیں ہیں۔ یہ نظریات و خیالات صحیح ہوں یا غلط، یہ ان لوگوں کے نظریات ہیں جنہیں امریکہ اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں کے سیاسی کلیساؤں نے کبھی اپنی برہمی کا نشانہ نہیں بنایا لیکن جرمنی کے ایک غریب اور فاقہ کش مفکر نے جو اپنے مرتے ہوئے بچے کا علاج تک نہیں کر سکا، جو اس کے مرتے پر کنن خریدنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا تھا، اس نے جب انسانوں کے بنیادی مسئلے کی سائنسی نشاں دہی کی تو وہ سرمایہ داروں کی تمام اقساموں میں مذہب روحانیت اور اخلاق کا باغی اور غدار ٹھہرا۔ یہ شخص ملکہس تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو نیم فاقہ کشی کی حالت میں سلدی دنیا کے انسانوں کے دکھ کا مداوا سوچا کرتا تھا اور ایک دن اپنے عظیم اور قابل تجدید استغراق کی حالت میں بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ ہم جب تاریخ فکر کے اس محبوب اور برگزیدہ بوڑھے اور اس کے زندگی پرورد حکیمانہ نظریے کا..... کیونرم کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے ذریعے اپنے عوام کی نیم جلی زندگی کا مداوا چاہتے ہیں تو ہم نئے مغربی سامراج اور اس

کے مقامی دلالوں کے نزدیک اپنے ملکوں کے باغی اور غدار ٹھہرتے ہیں۔

میں محسوس کر رہا ہوں جیسے میں فریادی ماتم کرنے لگا ہوں اور انفعالیات کا شکار ہو گیا۔ نہیں جناب ایسا ہرگز نہیں ہے، میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سرمایہ داری نظام کے قبیحہ خنوں کا گزر کر انہیں سرمایہ کھینچ کے لانا ہمارے فنون اور ہماری دانش کا فرض ہے، امریکہ اور مغربی یورپ کی دار سرمایہ داری کا وجود بیسویں صدی کے تمدنی شعور اور عمرانی احساسِ جمال کی توہین ہے۔ تہذیب، خیر، تناسب، حسن اور انسانیت عالیہ کے بہترین خوابوں کے وارث جو دنیا دراز حصوں میں بکھرے ہوئے ہیں اور جن کے دلوں کی دھڑکنیں ایک عالم گیر دل کا جذباتی آگس، فنی اور سماجی آہنگ ہیں انہیں یہ آہنگ اپنی اولوالعزم رودحوں کی پرتاثر، احساسِ خیز، اقد اور فیصلہ کن ہم آہنگی میں تحویل کر دینا چاہیے۔ ہم مغرب، مشرق، شمال اور جنوب کی فضلاء خواب دیکھنے والے شاعر اور ادیب..... اور شب و روز کی یکسانی میں انقلاب پرور زندگی بسر والے ہمارے درخشش دل، درخشش دانش اور درخشش بینش رہنما مثالیہ طلبی کی ایک ہی کیفیت ایک ہی حالت میں سانس لیتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی ہمارے سانس پھول بھی جلتے۔ یہ ایک تاریخی عملیہ ہے جس سے ہمارے تاریخ ساز مفکر، تخلیق کار اور کلرکن پڑ گزرتے چلے آئے ہیں اور اب ہم گزر رہے ہیں۔ ہم چلتے رہے ہیں، ہم چل رہے ہیں اور سب بڑی خوش خبری یہ ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ یقیناً ہماری اپنی اور ہم سب کی منزل تک پہنچ جائیں اور ہمارے، ہم نہ پہنچنے والوں کے تخلیقی خواب ان کی نگاہوں کے رہنما ہوں گے۔

ہم اپنے مثالیوں میں کسی قسم کی ترمیم اور تہنیت کرنے سے محذور ہیں۔ حسن اور خیر میں کوئی اور تہنیت نہیں کی جاسکتی۔ سیاسی جمہوریت کے ساتھ معاشی جمہوریت ہمارا مثالیہ رہی ہے اور رہے گی۔ طرز فکر اذعالی ہے۔ ہاں ہے تو۔



میرے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے میرے پاس اگر ایک ٹاپیہ بھی رہ گیا ہے تو وہ ان گھڑی کے مطابق ہزاروں آفات کا اٹا ہے جو میرے لیے بہت سے نئے خوابوں کی ضمانت بن سکتا ہے میں خواب دیکھنے کے سوا کوئی ہنر جانتا بھی تو نہیں۔

ہم ناپیدہ انقوتوں سے اٹھنے والے بادلوں کا انتظار کرتے رہے کہ ہمیں سستوں کو دھو آبدلوں کے ہزاروں سے چھتار پیزوں اور پودوں کو دھونا تھا جو تاریخ کی گرد انشالی سے گرد ہیں۔ تمہارے اور اپنے آنسوؤں سے بے سود گلہ مندوں کے چروں کو دھونا تھا.....

اور..... ان کی جنبشوں کے آہنگ پر چڑھانے والے پرندوں کو اور ان کے پروں کو، ان کی منقاروں کو دھونا تھا۔ ہواؤں اور بادلوں... اور بادلوں میں کوندتی ہوئی بجلیوں کو دھونا تھا۔ ہمیں اس دنیا کو دھونا تھا جس میں ہماری آج تک کی نسلیں سانس لیتی رہی ہیں۔ ہمیں یزدان ابھرن اور انسان کو دھونا تھا مگر ہم کچھ بھی نہیں کر سکے.....

میں اپنے بعد آنے والوں کے پہلے پرے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری، میرے ساتھیوں کی آنکھیں، ایک عمر سے سلگ رہی ہیں، جل رہی ہیں۔ میں ان آنے والوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنا، ان کے ماتھے چومنا اور پھر اپنی پلکیں بند کر لینا چاہتا ہوں۔

وہ آگے ہیں..... تم آگے! میں جون ایلیا ہوں، اچھا اب میں چلتا ہوں، تم نے بہت انتظار کرایا، اور ہاں تمہاری ایک اہمیت میرے پاس رہ گئی ہے۔ یہ میرے خام اور ناقص لفظ ہیں یعنی میرے اشعار۔ میرے وہ اشعار جو میں نہیں کہہ سکا۔ انہیں شاید ڈیوڈ کے گا یا احمد، یا کیلاش یا شاید منوچر..... اور اب میں تمام ہوتا ہوں۔

جون ایلیا

نگار خانہ اقبال صدی

کراچی

## سپاس گزارانہ

اردو کے حساس، تفکر پسند اور گہرا ادبی اور فنی ذوق رکھنے والے حلقے کے محبوب شاعر جناب جون ایلیا کے پہلے مجموعہ کلام ”شاید“ کا یہ عوامی ایڈیشن ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے ”شاید“ کا ڈیٹیکس ایڈیشن مارچ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا۔

یہاں یہ تذکرہ کرنا ضروری ہے کہ اس ایڈیشن کی اشاعت کا تمام تر بندوبست محترم جناب معراج رسول نے کیا ہے۔ ان کی غیر معمولی دلچسپی اور توجہ کے بغیر یہ کام اتنی جلد تکمیل پذیر نہ ہو سکتا۔ ان کے ادارے کے معزز ارکان نے اس ایڈیشن کی تیاری میں اپنا بے حد قیمتی وقت صرف کیا۔ ان میں سے دو کے نام سرفہرست ہیں، میرا اشرہ جناب انور فراز اور جناب خالد باری کی طرف ہے۔ آخر میں جناب اقبال مجیدی کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے اس سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ میں ایلیا اکادمیا کی طرف سے ان حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ممتاز سعید

۲۶ ویں فروری ۱۹۹۱ء

## دیباچہ طبع سوم

یہ "شاید" کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ پچھلے دو ایڈیشنوں میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں وہ اس ایڈیشن میں درست کردی گئی ہیں۔ مجموعے کی پشت پر مصنف کی دوسری تعینفات و تراجم کے جو نام لکھے ہیں، ان میں ایک نام رسائل اخوان الصفا ہے جو غلط ہے۔ اس کے بجائے "عدد" (NUMBER) ہونا چاہیے۔ رسائل اخوان الصفا وہ باون شہرہ آفاق رسائل ہیں جو دسویں صدی عیسوی (چوتھی صدی ہجری) میں فلسفیوں کے ایک زیر زمین (UNDERGROUND) گروہ نے عربی میں مرتب کیے تھے۔ یہ رسائل علوم و فنون کا انسائیکلو پیڈیا ہیں۔ ان میں سب سے پہلا رسالہ "عدد" پر ہے۔ جون ایلیا نے کئی رسائل کا ترجمہ کیا تھا، جن میں سے صرف پانچ محفوظ رکھے ہیں۔

شاید

میں شاید تم کو بکیر بھولنے والا ہوں

شاید، جانِ جاں شاید

کہ اب تم مجھ کو پہلے سے زیادہ یاد آتی ہو

ہے دل نغمگیں، بہت نغمگیں

کہ اب تم یاد دل دارانہ آتی ہو

شمیم دور ماندہ ہو

بہت رنجیدہ ہو مجھ سے

معراج رسول

یکم جون ۱۹۹۲ء

## دیباچہ طبع چہارم

اس میں کوئی شک نہیں کہ "شاید" گزشتہ کئی سالوں میں شائع ہونے والے تمام مجموعہ ہما کلام سے زیادہ مقبول ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شاید کہ پہلے دو ایڈیشن بہت جلد ختم ہو گئے تھے اور تیسرا ایڈیشن شائع کرنے کے بعد خیال تھا کہ اب نئے مجموعے کی طرف توجہ دی جائے گی۔ حیرت انگیز طور پر نہ صرف دو ماہ میں تیسرا ایڈیشن بھی ختم ہو گیا بلکہ شائقین کی طلب میں ہذا کوئی کمی نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ فوری طور پر چوتھی بار اشاعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ طبع ہذا میں حتی الامکان غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس میں ہم کس حد تک کامیاب رہے، یہ فیصلہ اہل نظر کریں گے اور امید ہے ہماری وہ نئی بھی فرمائیں گے۔

معراج رسول

تیسری اگست ۱۹۹۲ء

مگر پھر بھی

مشام جاں میں میرے آشتی مندانہ آتی ہو

جدائی میں بلا کا التفاتِ محرمانہ ہے

قیامت کی خبر گیری ہے

بے حد ناز برداری کا عالم ہے

متاعِ دل، متاعِ جاں تو پھر تم کم ہی یاد آؤ

بہت کچھ بہہ گیا ہے یلِ ماہِ و سال میں اب تک

سبھی کچھ تو نہ بہہ جائے

کہ میرے پاس رہ بھی کیا گیا ہے

کچھ تو رہ جائے

تمہارے رنگ مجھ میں اور گہرے ہوتے جاتے پر

میں ڈرتا ہوں

مرے احساس کے اس خواب کا انجام کیا ہو گا!

یہ میرے اندرونِ ذات کے تاراجِ گر،

جذبوں کے بیری وقت کی سازش نہ ہو کوئی

تمہارے اس طرح ہر لمحہ یاد آنے سے

دل سہا ہوا سا ہے

تو پھر تم کم ہی یاد آؤ

رمز

## نوائے درونی

نیلیوں حُزن کے اکناف میں گم ہوتے ہوئے  
مہرباں یاد کے اطراف میں گم ہوتے ہوئے  
بے طرف شام کے اہام کی سرسبزی میں  
جو تنفس سے خموشی کے سنا ہے میں نے  
ایسا نغمہ کسی آواز کے جنگل میں نہیں

تم جب آؤ گی تو کھویا ہوا پاؤ گی مجھے  
میری تنہائی میں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں  
میرے کمرے کو جانے کی تمنا ہے تمہیں  
میرے کمرے میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

ان کتابوں نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر  
ان میں اک رمز ہے جس رمز کا مارا ہوا ذہن  
شردہ عشرتِ انجم نہیں پاسکتا  
زندگی میں کبھی آرام نہیں پاسکتا

ملا زمانِ حرم نے وہ تنگیاں کی ہیں  
 فضائیں ہی نہ ہیں قصِ رنگ و بو کے لیے  
 یہ انتظام تو دیکھو خزاں پرستوں کا  
 بھائی جاتی ہیں سنگینیاں نمو کے لیے

## شہرِ آشوب

اسی ہوس میں ہیں ہر دم یہ دشمنانِ جمال  
 جو سوے رنگ اٹھے اس نظر کو گل کر دیں  
 جو بس چلے کہیں ان کا تو یہ فضا بیزار  
 شفق کا رنگ بھجادیں سحر کو گل کر دیں

گزر گئے پس در کی اشارتوں کے وہ دن  
 کہ رقص کرتے تھے مے خوار رنگ کھیلتے تھے  
 نہ محتسب کی تھی پروا نہ شہسوار کی تھی  
 ہم اہلِ دل سہ بازار رنگ کھیلتے تھے

ہوئی ہے جانبِ محراب سے وہ بارشِ سنگ  
 کہ عافیتِ حنیمِ ابرو کی ہے بہت دشوار  
 ستم کیا ہے عجب منجھتیق منبر نے  
 حریمِ دل کی سلامت نہیں رہی دیوار

غرورِ جبہ و دستار کا زمانہ ہے  
 نشاطِ فخر و بساطِ ہنس ہوئی برباد  
 فقیہ و مفتی و داعظ پہ حرف گیر ہو کون  
 یہ ہیں ملائکہ اور شہسوارِ جنتِ شاد

یہ عہد وہ ہے کہ دانشورانِ عہد پہ بھی  
مناقت کی شبیہوں کا خوف طاری ہے  
نازِ خوف کے دن ہیں کہ ان دنوں یارو  
قلندروں پہ فقیہوں کا خوف طاری ہے

دیا ہے کام انھیں شب کے سرپتوں نے  
پسیدہ سحری کو سیاہ کرنے کا  
لا ہے عہدہ کلیاے غربے۔ ان کو  
شعورِ مشرقِ نو کو تباہ کرنے کا

یہ ہیں وہ تیسرہ دلانِ فتل و تاربخ  
جو روشنائیِ دانش کا خون کرتے رہے  
یہی تو ہیں جو حکیموں کی حکمتوں کے خلاف  
ہر اک دور میں حاکم کے کان بھرتے رہے

گذشتہ عہد گزرنے ہی میں نہیں آتا  
یہ حادثہ بھی لکھو معجزوں کے خانے میں  
جو رد ہوئے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے  
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں

ہیں فطرتوں کی مرتی طبیعتیں ان کی  
کبھی یہ روشنیِ طبع کو نہیں مانے  
ہے روشنی کا انھیں ایک ہی نظارہ پسند  
کہ جشنِ فتح منے اور جلیں کتب خانے



## اجنبی شام

## وصال

وہ میرا خیال تھی، سو وہ تھی  
میں اُس کا خیال تھا، سو میں تھا  
اب دونوں خیال مر چکے ہیں

دھند چھائی ہوتی ہے جھیلوں پر  
اڑ رہے ہیں پند ٹیسوں پر  
سب کا رخ ہے نشیمنوں کی طرف  
بستیوں کی طرف بنوں کی طرف

اپنے گلوں کو لے کے چرواہے  
سرحدی بستیوں میں جا پہنچے  
دلِ ناکام! میں کہاں جاؤں؟  
اجنبی شام! میں کہاں جاؤں؟

اور اک جریدہ نگارِ صبح شعورِ محنت نے آج کے دن  
بنامِ محنت کشاں یہ پیغامِ حق سپردِ مسلم کیا تھا

آلمِ نصیبو! بہادری سے، ستمِ نصیبو! بہادری سے  
صفوں کو اپنی درست کر لو کہ جنگِ آغاز ہو چکی ہے  
تھارے کتنے ہی باہنر ہاتھ ہیں جو بے روزگار ہیں آج  
تھارے کتنے بڑھال ڈھانچے گھروں میں بے انتظار ہیں آج

نظامِ دولت کے پنجہ ہائے درشت و غوین شروع ہی سے  
فریبِ قانون و امن کی آڑ میں چھپے ہیں، چھپے لہے ہیں  
گردِ محنت کشاں ہو تیری زبان پر اب بس ایک نعرہ  
مفاہمت ختم ہو چکی ہے، مفاہمت ختم ہو چکی ہے  
شکروں سے ستم کشوں کی معاملات ختم ہو چکی ہے  
یکم مئی کا حسابِ عظمت تو آنے والے ہی کر سکیں گے

یہاں میں نے اس عہدِ آفریں تحریک کے ایک حصے کا مفہوم نظم کیا ہے جو یکم مئی کی صبح کو  
مزدوروں کے ایک انجمن میں شائع ہوئی تھی جن ایسی

## اعلانِ رنگ

سفید پرچم، سفید پرچم  
یہ اُن کا پرچم تھا جو شکاگو کے چوک میں جمع ہو لہے تھے  
جو نرم لہجوں میں اپنی محرومیوں کی شدت سمو لہے تھے  
کہ ہم بھی حق دارِ زندگی ہیں مگر دل انکارِ زندگی ہیں  
ہمارے دل میں بھی کچھ انگلیں ہیں ہم بھی کچھ خواب دیکھتے ہیں  
خوشی ہی آنکھیں نہیں سجاتی ہے، غم بھی کچھ خواب دیکھتے ہیں

یکم مئی کی سحر نے جب اپنا نفسِ مضمون رقم کیا تھا  
بلا نصیبوں کو زندگی کی انگ نے ہر قدم کیا تھا

ہجوم گنجان ہو گیا تھا ، عمل کا اعلان ہو گیا تھا  
 تام مرد میاں ہم آواز ہو گئی تھیں کہ ہم یہاں ہیں  
 ہمارے سینوں میں ہیں خراشیں ہمارے جسموں پہ دھجیاں ہیں  
 ہمیں مشینوں کا رزق ٹھیرا کے ، رزق چھینا گیا ہمارا  
 ہماری بخشش پہ پلنے والو ، ہمارا حصہ تباہیاں ہیں

مگر یہ اک خواب تھا وہ اک خواب جس کی تعبیر خونچکاں تھی  
 رقم جو کی تھی قلم لے سرمایے کے وہ تحریر خونچکاں تھی  
 سفید پرچم نے خون محنت کو اپنے سینے پہ مل لیا تھا  
 یہ وقت کی سر بلند تدبیر تھی یہ تدبیر خونچکاں تھی  
 دیارِ تاریخ کی فضاؤں میں سرخ پرچم ابھر رہا تھا  
 یہ زندگی کی جلیل تنویر تھی یہ تنویر خونچکاں تھی

یکم مئی خون شدہ انگلوں کی حق طلب برہی کا دن ہے  
 یکم مئی زندگی کے زخموں کی سرخو شاعری کا دن ہے

یکم مئی اپنے خونِ ناطق کی سُرخ پیغی سببری کا دن ہے  
 یکم مئی زندگی کا اعلانِ رنگ ہے زندگی کا دن ہے

یہ زندگی خون کا سفر ہے اور ابستلا اس کی دگنڈر ہے  
 جو خون اس سیلِ خوں کی موجوں کو تند کر دے وہ نامور ہے  
 یہ خون ہے خونِ سر زندہ ، یہ خونِ زندہ ہے خونِ زندہ  
 وہ خونِ پرچم فراز ہو گا جو خونِ زندہ کا ہمسفر ہے

یہ خون ہے سرنام یعنی سرنامہ کتابِ اُمم یہ خون ہے  
 ادب کہ اجتہادِ تاریخ میں نصابِ اُمم یہ خون ہے  
 صلیبِ اعلانِ حرفِ حق کا خطیب بھی یہ خطاب بھی یہ  
 یہ اپنا ناشر ہے اور منشورِ انقلابِ اُمم یہ خون ہے  
 یہ خون ہی خیرِ جسم و جاں ہے اس امتحانِ گاہِ زندگی میں  
 جہاں کہیں ظلم طعنہ زن ہو وہاں جوابِ اُمم یہ خون ہے

یہ خون ہی خواب دیکھتا ہے ٹکٹ کی شب بھی صبح نو کے  
 پھر اپنی ہی گردشوں میں تعبیر کوشِ خوابِ اُمم یہ خون ہے  
 یہ خون اٹھاتا ہے غاصبوں کے خلاف طوفانِ بغاوتوں کے  
 ہوں عام جب زندگی کی خوشیاں تو آبِ و تابِ اُمم یہ خون ہے

## تَعاقُب

مجھ سے پہلے کے دن  
 اب بہت یاد آنے لگے ہیں تمہیں  
 خواب و تعبیر کے گم شدہ سلسلے  
 بار بار اب ستانے لگے ہیں تمہیں  
 دکھ جو پہنچے تھے تم سے کسی کو کبھی  
 دیر تک اب جگانے لگے ہیں تمہیں

اب بہت یاد آنے لگے ہیں تمہیں  
 اپنے وہ عہد و پیمان جو مجھ سے نہ تھے  
 کیا تمہیں مجھ سے اب کچھ بھی کہنا نہیں؟

جو ظلم سے دو بدو ہیں ان کی صفوں کو قوت پلاؤ، آؤ  
 اسی طرح خونِ زندہ ہر زماں، جہاں اقتدار ہو گا  
 نفاق اور افتراق ہی میں پناہ لیتے رہے ہیں ظالم  
 جو ظالموں کو پناہ دے گا وہ ظالموں میں شمار ہو گا

میرے سینے میں چبھ رہا ہے وجود  
اور دل میں سوال سا کچھ ہے  
وقت مجھ کو نہ چھین لے مجھ سے  
سرخوشی میں لال سا کچھ ہے

میری جاں! ایک دوسرے کے لیے  
جانے ہم ناگزیر ہیں کہ نہیں  
تم جو ہو تم ہو، میں جو ہوں میں ہوں  
دل ہوا ہے سکوں پذیر کہیں

## دوتی

بے خوش ہو، دمک رہی ہو تم  
رنگ ہو اور مہک رہی ہو تم  
بے خوش! خود کو روبرو تو کرو  
رنگ! تم مجھ سے گفتگو تو کرو

وقت ہے لمحہ لمحہ ہجوری  
چاہے تم میری ہم نشیں بھی ہو  
ہے تمہاری مہک میں حُزنِ خیال  
جیسے تم ہو بھی اور نہیں بھی ہو

اور سرتا سر ارضِ بابل میں یعقوب کے مرد و زن  
 جاں کنی کی اذیت میں  
 زندہ رکھے جا رہے ہیں  
 یہی اُن کا مقصوم تھا  
 اور ازل سے خداوند آسودہ ہے

## بُرجِ بابل

بُرجِ بابل کے بارے میں تو نے سنا؟  
 بُرج کی سب سے اوپر کی منزل کے بارے میں تو نے سنا؟  
 ”مجھ سے کلدانیوں، کاہنوں نے کہا  
 بُرج کی سب سے اوپر کی منزل میں  
 اک تختِ خوابِ قداست ہے  
 جس پر خداوند آرام فرما رہا ہے“<sup>۱</sup>  
 خداوند اُن کا خدا  
 حضرت اقدسِ کبریا

<sup>۱</sup> لے بنو اسرائیل کے دورِ اسیری کے بعد کے یونانی مورخ ہیروڈوٹس کے بیان سے استفاداً

## بس ایک اندازہ

بس گزرے تمہیں سوتے ہوتے  
اٹھ جاؤ، سنتی ہو، اب اٹھ جاؤ  
میں آیا ہوں

میں اندازے سے سمجھا ہوں

یہاں سوئی ہوئی ہو تم

یہاں، روے زمیں کے اس مقام آسمانی ترکی حد میں

باد ہلے تند نے

میرے لیے بس ایک اندازہ ہی چھوڑا ہے

## سلسلہ تمنا کا

خیال و خواب کو اب مل نہیں رہی ہے اماں  
نہ اب وہ متی دل ہے نہ اب وہ نشہ جاں  
نہ ٹوٹ جائے کہیں سلسلہ تمنا کا

جو درد و دل کا تھا رشتہ اُسے بجالا کرو

نہیں ہے گردشِ ساغر تو گردشِ نون ہے

سو اپنی گردشِ نون سے ہی کچھ سوال کرو

ذرا تو سلسلہ رنگ کا خیال کرو

زوالِ حال کے دن ہیں کوئی کمال کرو

ہے فصلِ یاس تو خود کو کوئی فریب ہی دیں  
 کوئی امید دلاؤ کہ آرزو تو رہے  
 نظر اٹھے نہ اٹھے دل ہی کچھ ٹھہر جائے  
 قدم اٹھیں نہ اٹھیں کوئی جستجو تو رہے  
 ہو چارہ عنہم جاں کیا یہ گفتگو تو رہے

## قطرہ در جہنم نشینانِ خود

دا دروغا کہ ہم نشیں میرے  
 میرا طرزِ بیاں چراتے ہیں  
 حیف صد حیف نقدِ جاں کے امیں  
 کیسہ نقدِ جاں چراتے ہیں  
 اہماتِ یقین کے رحموں سے  
 نطفہ نطفہ گماں چراتے ہیں  
 خس و خاشاک طبع ہیں لیکن  
 دمِ شعلہ فشاں چراتے ہیں

کہ دل کے حال کو پُر ماجرا تو رکھنا ہے  
 خیالِ ناز و لحاظِ ادا تو رکھنا ہے  
 نہ پیچھے مے حسرتِ بیاہنگ چنگِ مگر  
 کسی کی چشم سے کچھ سلسلہ تو رکھنا ہے  
 جو دل کا خون ہوا ہے اُسے بھلا دیں کیا  
 حسابِ بیش و کمِ خون بہا تو رکھنا ہے  
 شبِ درازِ جدائی ہے آرزو کی حریف  
 سو زخمِ شوق کو جلتا ہوا تو رکھنا ہے  
 نہ ٹوٹ جائے کہیں سلسلہ تمنا کا



ان پہ ہنسیے کہ روئیے احمد  
 رایگاں ، شایگاں چراتے ہیں  
 نقل کر کے کراہنے کی مرے  
 میری بیماریاں چراتے ہیں  
 معترف ہوں کمال کا ان کے  
 میرے دل کا سماں چراتے ہیں  
 مے کش ایسے کہ اپنے نشے میں  
 میری انگریزیاں چراتے ہیں  
 کیا بتاؤں ہیں کیسے دیدہ دلیر  
 مجھ سے ہی مجھ کو ہاں چراتے ہیں

## اذیت کی یادداشت

موسم جسم و جاں ، رایگاں  
 دل زمستان زدہ طائر بے اماں  
 جس میں اب گرمی خواب پرواز تک بھی نہیں  
 دم بہ دم اُس گذشتہ میں برباد جانے کا احساس  
 جو ناگذشتہ کی سعی تلافی سے نوید ہے  
 روز، ہر روز

بے خواب آنکھوں میں چبھتا ہوا عکس آئینہ آتشیں  
 شب، سرشب سے تا آخر شب  
 یقین دگماں کی پیاپے ٹمکتیں

کہ اب مُہلتِ عمر کی وہ لگک بھی نہیں ہے  
نفس، ہر نفس اپنی بے خواب آنکھوں سے اپنا تماشا  
کہ یہ آدمی اپنے بستر پہ بے وار مارا گیا  
صبح سے شام تک  
منظروں کی نگاہوں میں وہ ناشناسی  
کہ شاید میں گزرے زمانوں میں آیا تھا  
آیا بھی تھا یا نہیں

## دیرِ کچھ ہاے خیال

چاہتا ہوں کہ بھول جاؤں تمہیں  
اور یہ سب دیرِ کچھ ہاے خیال  
جو تمہاری ہی سمت کھلتے ہیں  
بند کر دوں کچھ اس طرح کہ یہاں  
یاد کی اک کرن بھی آنے سکے

چاہتا ہوں کہ بھول جاؤں تمہیں  
اور خود بھی نہ یاد آؤں تمہیں  
جیسے تم صرف اک کہانی تھیں  
جیسے میں صرف اک فسانہ تھا

بیزار ہو گئی ہو بہت زندگی سے تم  
جب بس میں کچھ نہیں ہے تو بیزار ہی رہو  
تم کو یہاں کے سایہ و پرتو سے کیا غرض  
تم اپنے حق میں بیچ کی دیوار ہی رہو

سزا

میں ابتداءے عشق سے بے مہر ہی رہا  
تم انتہاءے عشق کا معیار ہی رہو  
تم خون تھوکتی ہو یہ سُن کر خوشی ہوئی  
اس رنگ اس ادا میں بھی چرکار ہی رہو

میں نے یہ کب کہا تھا محبت میں ہے نجات  
میں نے یہ کب کہا تھا وفا دار ہی رہو  
اپنی مستراح ناز لٹا کر مرے لیے  
بازارِ التفات میں نادار ہی رہو

ہر بار میرے سامنے آتی رہی ہو تم  
ہر بار تم سے مل کے بچھڑتا رہا ہوں میں  
تم کون ہو یہ خود بھی نہیں جانتی ہو تم  
میں کون ہوں یہ خود بھی نہیں جانتا ہوں میں  
تم مجھ کو جان کر ہی پڑی ہو عذاب میں  
اور اس طرح خود اپنی سزا بن گئی ہو میں

تم جس زمین پر ہو میں اس کا خدا نہیں  
پس سرسبر اذیت و آزار ہی رہو

جب میں تمہیں نشاطِ محبت نہ دے سکا  
غم میں کبھی سکونِ رفاقت نہ دے سکا  
جب میرے سب چراغِ تنہا ہوا کے ہیں  
جب میرے سارے خواب کسی بے وفا کے ہیں  
پھر مجھ کو چاہنے کا تمہیں کوئی حق نہیں  
تنہا کراہنے کا تمہیں کوئی حق نہیں

## سُوفسطا

وہ جو ہے ، وہ مجھے  
میرے شائستہ افکار  
میرے ستودہ خیالات سے  
باز رکھنے کی کوشش میں  
ہر لمحہ سرگرم رہتا ہے  
کل رات کی بات ہے  
وہ پروٹاگورس کا جانا  
لفظہٴ نابجائے سُوفسطائیاں

میرے بستر پہ کوٹ بدلتے ہوئے  
آپ ہی آپ کہنے لگا

لفظ معنی سے برتر ہیں

میں قبل سقراط کے سب زباں درحکیموں

کے سر کی قسم

کھا کے کہتا ہوں

یہ میری اُطلوٹہ ذاتی نہیں

ٹاڑ خانی نہیں

لفظ برتر ہیں، معنی سے، معنائے ذی جاہ سے

اور وہ یوں کہ معنی تو پہلے سے موجود تھے

سُن رہے ہو! میں واہی تباہی نہیں بک رہا

اپنی بستی کا سر شور، بیہودہ گفتار دیوانہ، 'جوداگرم'

اپنے ہیجانِ معنی کی حالت میں

علامہ ایلیا سے کسی طور بھی کم نہ تھا

یہ بھی سُن لیجیے!

لے میرے بابا علامہ سید شفیق حسن ایلیا۔ جون

واؤس تک سرورِ بگِ الہامِ معنی سے پُر مایہ ہے  
اب رہے لفظ [بیمچارے، جن کی، جنہیں مُبدعانہ روش سے

برتنے کے دشوار پرداز کی رستورانوں کے

اسماں طلب، نابہ ہنگام فقرہ طراز اور غوغائی

دانشوروں، شاعروں کے تئیں

ایک خارش زدہ بھیڑ کی چھینک سے

کچھ زیادہ حقیقت نہیں

کیا یہ بکواس ہے، صرف بکواس؟]

ہاں لفظ ایجاد ہیں

یہ ہزاروں، ہزاروں برس کے

سراسیمہ مگر اجتہادِ تکلم کا انعام ہیں

ان کے انساب ہیں

جن کی اسناد ہیں

اور پھر ان کی تاریخ ہے

اور معنی کی تاریخ کوئی نہیں

گلے ملتے ہوئے رشتوں کی فرقت کے وہ آنسو  
پھر نہ رو پائیں

## اس رایگانی میں

سو وہ آنسو ہمارے آخری آنسو تھے  
جو ہم نے گلے دل کر بہائے تھے  
نہ جانے وقت ان آنکھوں سے پھر کس طور پیش آیا  
مگر میری فریبِ وقت کی بہکی ہوئی آنکھوں نے  
اُس کے بعد بھی  
آنسو بہتے ہیں  
مرے دل نے بہت سے دکھ رچائے ہیں  
مگر یوں ہے کہ ماہ و سال کی اس رایگانی میں  
مری آنکھیں

مگر یہ زخم یہ مرہم ...

تمہارے نام تمہارے نشان سے بے فرکار  
تمہاری یاد کے موسم گزرتے جاتے ہیں  
بس ایک منظر بے ہجر و وصل ہے جس میں  
ہم اپنے آپ ہی کچھ رنگ بھرتے جاتے ہیں

نہ وہ نشاۃ تصور کہ لو تم آہی گئے  
نہ زخمِ دل کی ہے سوزش کوئی جو سہنی ہو  
نہ کوئی وعدہ و پیمان کی شام ہے نہ سحر  
نہ شوق کی ہے کوئی داستاں جو کہنی ہو

بے اثبات

کس کو فرصت کہ مجھ سے بحث کے  
اور ثبات کرے کہ میرا وجود—  
زندگی کے لیے ضروری ہے

نہیں جو محلِ لیلایے آرزو سہِ راہ  
 تو اب فضا میں فضا کے سوا کچھ اور نہیں  
 نہیں جو موجِ صبا میں کوئی شمیمِ پیام  
 تو اب صبا میں صبا کے سوا کچھ اور نہیں

## جشن کا اسباب

سکوتِ بیکراں میں سہ پہر کا چوک ویراں ہے  
 دکائیں بند ہیں  
 سارے دریچے بے تنفس ہیں  
 درو دیوار کہتے ہیں

یہاں سے ایک سیلِ شعلہ ہلے تند گزرا ہے  
 پھر اس کے بعد کوئی بھی نہیں آیا  
 خموشی کوچہ و بزمین میں فریادی ہے  
 کوئی تو گزر جائے  
 کوئی آوازِ پائے

اتار دے جو کنارے پہ ہر دم کو کشتیِ دم  
 تو گرد و پیش کو گرداب ہی سمجھتے ہیں  
 تمہارے رنگ مہکتے ہیں خواب میں جب بھی  
 تو خواب میں بھی انھیں خواب ہی سمجھتے ہیں

نہ کوئی زحمت نہ مرہم کہ زندگی اپنی  
 گزر رہی ہے ہر احساس کو گنوانے میں  
 مگر یہ زحمت یہ مرہم بھی کم نہیں شاید  
 کہ ہم ہیں ایک زمیں پر اور اک زمانے میں



شمارِ لمح و ساعت سے بیگانہ فضا میں  
اک صدائے پُرفشانی کونڈا اٹھتی ہے  
کوئی طائرِ فضا میں سایہ آسا تیر جاتا ہے  
سگانِ زرد کا اک غول اک کوچے سے نکلا ہے  
وہ تیزی سے گزر جاتے ہیں  
وہ اور اُن کے سایے بھی  
سکوتِ بیکراں میں سہ پہر کا چوک دیاں ہے

سرزمینِ خواب و خیال  
یومِ پاکستان کے موقع پر

ہم نے اے سرزمینِ خواب و خیال  
تجھ سے رکھا ہے شوق کو پُرحال

ہم نے تیری امید گاہوں میں  
کی ہے اپنے مثالوں کی تلاش  
دل کے رنگِ خیال بندی کو  
تو بھی اک بار دیکھ لے اے کاشش

خترت جاں ! ترے غزالوں کو  
ہم نے جاں غزل بنایا ہے  
ہم نے دکھ سہ کے تیرے لمحوں کو  
جاودانِ غزل بنایا ہے

ذکر سے ہم ترے حسینوں کے  
شوخ گفتار و نموش کلام ہوئے  
تیرزی گلیوں میں ہو کے ہم بزم  
ککتنے شہروں میں نیک نام ہوئے

حسین فردا کے خواب دیکھے ہیں  
شوق نے تیری خواب گاہوں میں  
ہم نے اپنا سراغ پایا ہے  
تیرزی گلیوں میں تیری راہوں میں

تیری راتیں ہمارے خوابوں سے  
اور بھی کچھ سہانیاں ہوں گی  
ہم جو باتیں بنوں میں بکتے ہیں  
دیکھنا جاودانیاں ہوں گی  
ہم ہیں وہ ماجرا طلب جن کی  
داستانیں زبانیاں ہوں گی  
تیری محفل میں ہم نہیں ہوں گے  
پر ہماری کہانیاں ہوں گی

جو تھے دشمن تری مسنگوں کے  
کب انھیں بے گرفت چھوڑا ہے  
ہم نے اپنے درشت لہجے سے  
آمروں کا عنبر توڑا ہے

خوش بدن اسپرین ہو سُرخ ترا  
دلبرا ! بانچن ہو سُرخ ترا  
ہم بھی رنگیں ہوں پرتو گل سے  
جوش گل سے چمن ہو سُرخ ترا

تیرے صحرا بھی پُربہار رہیں  
غنچہ خیز و شگوفہ کار رہیں  
دل بہ دل ربطِ جاں رہے تجھ سے  
صف بہ صف تیرے جاں نثار رہیں

ہر فسانہ بہم کہا جائے  
میں جو بولوں تو ہم کہا جائے

ہم تو خاطر میں بھی نہیں لاتے  
اہل دولت کو شہر یاروں کو  
ہم نوا گر ترے عوام کے ہیں  
دوست رکھتے ہیں تیرے پیاروں کو

تو ہے کاوش کا جن کی گلدستہ  
اُن کا نام اُن کی نانداری ہو  
تیرے شہروں میں اور دیاروں میں  
حکم محنت کشوں کا جاری ہو

یہ بڑی سازگار مہلت ہے  
یہ زمانہ بہت غنیمت ہے

شوق سے دلو لے طلب کر لیں  
جو نہ اب تک کیا وہ اب کر لیں

## معمول

## رمز ہمیشہ

اے خدا، اے خدایاں خدا، اے خداوند  
میں تجھ سے معمور تھا  
خود سے مسحور تھا  
اور اک میں ہی کیا  
نیگیوں آسمانوں سے دیوان خانے کی  
سرسبز  
مہکتی نفس  
کیاریوں تک کا سارا سماں  
تجھ سے معمور تھا

جانے کب سے  
مجھے یاد بھی تو نہیں جانے کب سے  
ہم اک ساتھ گھر سے نکلتے ہیں  
اور شام کو  
ایک ہی ساتھ گھر لوٹتے ہیں  
مگر ہم نے اک دوسرے سے  
کبھی حال پرسی نہیں کی  
نہ اک دوسرے کو  
کبھی نام لے کر مخاطب کیا  
جانے ہم کون ہیں !

خود سے مسحور تھا

شہر میں معجزوں اور

موسم کے میوؤں کی بہتات تھی  
اور میوؤں کی چاہے کسی فصل میں  
کچھ کمی بھی ہوئی ہو

مگر معجزے

روز افزوں تھے

ایمان کا ابر باذل

دلوں کی زراعت کو شاداب رکھتا تھا  
شام و سحر اپنے مرموز آغاز و انجام کے

سُن میں

محو رہتے تھے

وہ دور اپنے تختیر کی نرسند حالت میں  
اور اپنے ابہام کی دست و دل باز سمتوں کے  
پندارہ پرور مرامیز کی ہر علامت میں

اک خواب کا خواب تھا  
خواب کی رُو بردی تھی  
اور چار سوئی تھی  
ہم خواب تھے اور خوابوں میں مشغول تھے

ایک دن

شہر کے ایک شیوا بیاں اور خوش لہجہ نثار  
دیوان خانے میں تشریف لائے  
جہاں ابن سکت کا  
تذکرہ ہو رہا تھا

ذرا دیر کے بعد

اس تذکرے کے تسلسل میں وقفہ سا پیدا ہوا  
پس وہ بابا کی جانب نظر کر کے گویا ہوئے  
آپ حضرات نے آج کا معجزہ سُن لیا؟  
اُن پہ اک حالتِ گریہ طاری تھی

پھر وہ گلوگیر آداز میں  
ساری رُوداد اُس معجزے کی سنانے لگے  
جو عزا خانہ شاہ مسکین میں  
دیکھ کر آئے تھے

مجھ کو اُن کا بیاں آج بھی یاد ہے  
اک جواں حالتِ جاں کنی میں  
ضریحِ مقدس کے محضر میں لایا گیا  
اور اُس کو علم کے پھریرے کی  
انفاس پرور ہوا دی گئی  
اور پھر یہ ہوا

وہ جواں اس طرح چونک اٹھا  
جیسے اب تک وہ سویا ہوا تھا  
مگر اب کسی کے جگانے سے  
یک بارگی جاگ اٹھا ہے

اُسے اک نئی زندگی مل گئی تھی  
وہاں کوئی بھی شخص ایسا نہیں تھا  
جسے اس پہ حیرت ہوئی ہو  
کہ یہ بات تو  
چھوٹے حضرت کے صدقے میں ہونی ہی تھی

وہ نجمتہ وہ خوش ماجرا روز و شب  
روز و شب ہی نہ تھے  
اک زمانِ الوہی کا انعام جاری تھے  
اور ایک رمزِ ہمیشہ کا  
حرِ چشمہ جاوداں تھے  
وہ حرِ چشمہ جاوداں جس کی تاثیر سے  
اپنا احساسِ ذات ایک الہام تھا  
جس سے روح در و بام مرثاد تھی  
اُس فضا میں کوئی شے فقط شے نہ تھی

خوش بین دوزند تھے  
اے خدادند! میں تجھ سے معمور تھا

اور پھر  
عقل انگیزہ جو درمیاں آگئی اے خدا  
ایک سفاک پرخاش و پیکار تھی  
جو مرے اور مرے درمیاں چھڑ گئی تھی  
مرے ذہن میں  
ناسزا، جان گزا آگئی کا جہنم بھڑکنے لگا

اور پھر  
وہ زمانہ بھی آیا کہ جب  
میں ترے باب میں مضمل ہو گیا  
ہوادیناگر نفی و انکار نے  
اُن فرخاک اُسرار کے

ایک معنی تھی  
معنی کا فیضان تھی

کتنا شفاف تھا روح کا آسماں  
کتنی شاداب تھی آگئی کی زمیں

ہم کو اپنا نسب نامہ تا آدمؑ برالبشر یاد تھا  
قبل تاریخ کی ساری تاریخ ذہنوں میں محفوظ تھی  
ہم کو صبحِ نخستین ایجاد سے  
اپنے ابدال تک  
اپنے دالان و در  
ان کی بنیاد تک  
ساری تفصیل کون و مکاں یاد تھی  
ہم سب اپنے یقین دگماں کے فرخاک  
اسرار میں  
شاد و خرم تھے

قرنوں کی دوری میں  
گم ہو چکی ہے  
میں تنہا ہوں  
بے چارہ ہوں

جب میں دائیں طرف دیکھتا تھا  
تو کیا دیکھتا تھا  
کہ انجیر و شہتوت پڑمردہ ہیں  
جب میں بائیں طرف دیکھتا تھا  
تو کیا دیکھتا تھا  
کہ سارے شمالی پرندے  
جنوبی اُفتی کے زبونی زدہ  
زرد ابھام میں  
پھڑپھڑاتے ہوئے  
بے نشاں ہوتے جاتے ہیں

عالم خواب آگئیں کو زیر و زبر کر دیا  
وہ نجستہ وہ خوش ماجرا روز و شب  
وہم و خواب و خیال و گماں ہو گئے  
وہ معانی وہ احوالِ جاں آفریں  
بے اماں ہو گئے  
فیضِ ترفیق کی  
وہ رسد رک گئی  
وہ یقین کے اُفتی  
بے نشاں ہو گئے  
جو بھی آسان تر تھا وہ دشوار تر ہو گیا

میری حالت یہ تھی  
جیسے میں اک سفر کردہ دور افتادہ ہوں  
اور ایقانِ فرخندہ و برگزیدہ کی وہ سرزبیں  
میرے لمسِ کفِ پا سے



حسرتاً! لککشاؤں کے گلوں کا چوپان کوئی نہیں

اور پھر میں نے  
موجود کے دائرے کی نہایت پہ نالہ کیا  
اے یقیں کے گماں  
اے گماں کے یقیں  
اے ازل آفریں  
اے ابد آفریں  
اے خدا الوداع  
اے خدایاں خدا  
الوداع، الوداع

تب میں نے گزرے زمانوں میں  
اور آنے والے زمانوں میں فریاد کی  
اے خدا!

اے خداوند!

اب مرا باطن ذات ویران ہے  
اب درون دروں  
اور بیرون بیرون  
فقط اک خلا ہے  
فقط ایک لا

دہر دہر اور دیوم دیوم میں  
اب عدم در عدم کے سوا کچھ نہیں  
اے خداوند تو کیا ہوا

مجھ کو تیرے نہ ہونے کی عادت نہیں  
ولے برجالِ ثرفا و بالا و پنا!

دریغا! سبب ہر مستب سے اپنے جدا ہو گیا

افانہ ساز جس کا فراق و وصال تھا  
 شاید وہ میرا خواب تھا شاید خیال تھا  
 یادش بخیر زخمِ تمنا کی فصلِ رنگ  
 بعد اس کے ہم تھے اور غمِ اندام تھا  
 دشتِ گماں میں ناقہِ لیلیٰ تھا گرم خیز  
 شہرِ زیاں میں تیس ابرِ عیال تھا  
 خونِ جگر کھپا کے مصور نے، یک نظر  
 دیکھا تو اک مرقعِ بے خد و حال تھا  
 کل شورِ عرضِ گاہِ سوال و جواب میں  
 جو بھی خموش تھا وہ عجب باکال تھا  
 ہم ایک بے گذشتِ زمانہ زمانے میں  
 تھے حالِ مستِ حال جو ہر دم بحال تھا

شق سمجھے تھے جس کو وہ شاید  
 فابس اک نارسائی کا رشتہ  
 میرے اور اُس کے دریاں نکلا  
 عمر بھر کی جدائی کا رشتہ

پُر حال تھا وہ شب مرے آغوش میں مگر  
 اُس حال میں بھی اُس کا تقرب محال تھا  
 تھا مست اُس کے ناف پیالے کا میرا دل  
 اُس لب کی آرزو میں مرا رنگ لال تھا  
 اُس کے عروج کی تھی بہت آرزو ہمیں  
 جس کے عروج ہی میں ہمارا زوال تھا  
 اب کیا حسابِ رفتہ و آئندہ گماں  
 اک لمحہ تھا جو روز و شب و ماہ و سال تھا  
 کل ایک قصرِ عیش میں بزمِ سخن تھی جون  
 جو کچھ بھی تھا دہاں وہ غریبوں کا مال تھا

گنوائی کس کی تمنا میں زندگی میں نے  
 وہ کون ہے جسے دیکھا نہیں کبھی میں نے  
 ترا خیال تو ہے پُر ترا وجود نہیں  
 ترے لیے تو یہ محفل سجائی تھی میں نے  
 ترے عدم کو گوارا نہ تھا وجودِ مرا  
 سو اپنی بیخ کنی میں کمی نہ کی میں نے  
 ہیں میری ذات سے منسوب صد فسانہ عشق  
 اور ایک سطر بھی اب تک نہیں لکھی میں نے  
 ان خود اپنے عشوہ و انداز کا شہید ہوں میں  
 خود اپنی ذات سے بقی ہے بے رخی میں نے  
 مرے حریف مری بیکہ تازیوں پہ نثار  
 تمام عمر حلیفوں سے جنگ کی میں نے

خراشِ نغمہ سے سینہ چھلا ہوا ہے مرا  
 فُغاں کہ ترک نہ کی نغمہ پروری میں نے  
 دوا سے نائدہ مقصود تھا ہی کب کہ فقط  
 دوا کے شوق میں صحت تباہ کی میں نے  
 زبانہ زن تھا جگر سوز تشنگی کا عذاب  
 سو جو ف سینہ میں دوزخ اٹیل لی میں نے  
 سرورِ مے پہ بھی غالب رہا شعورِ مرا  
 کہ ہر رعایتِ نغمِ ذہن میں رکھی میں نے  
 نغمِ شعور کوئی دم تو مجھ کو ہمت دے  
 تمام عمر جلایا ہے اپنا جی میں نے  
 علاج یہ ہے کہ مجبور کر دیا جاؤں  
 وگرنہ یوں تو کسی کی نہیں سستی میں نے  
 رہا میں شاہدِ تنہا نشینِ مسندِ نغم  
 اور اپنے کربِ انا سے غرض رکھی میں نے

ایذا دہی کی داد جو پاتا رہا ہوں میں  
 ہر ناز آفریں کو ستاتا رہا ہوں میں  
 اے خوش خرام! پاؤں کے چھالے تو گن ذرا  
 تجھ کو کہاں کہاں نہ پھراتا رہا ہوں میں  
 تجھ کو خبر نہیں کہ ترا حال دیکھ کر  
 اکثر ترا مذاق اڑاتا رہا ہوں میں  
 جس دن سے اعتماد میں آیا ترا شباب  
 اُس دن سے تجھ پہ ظلم ہی ڈھاتا رہا ہوں میں  
 بیدار کر کے تیرے بدن کی خود آگہی  
 تیرے بدن کی عمر گھٹاتا رہا ہوں میں  
 اک سطر بھی کہی نہ لکھی میں نے تیرے نام  
 پاگل تجھی کو یاد بھی آتا رہا ہوں میں

ناہد مجھے کسی سے محبت نہیں ہوتی  
 لیکن یقین سب کو دلانا رہا ہوں میں  
 اک حُسنِ بے مثال کی تمثیل کے لیے  
 پرچھائیں پہ رنگ گراتا رہا ہوں میں  
 اپنا مثالیہ مجھے اب تک نہ مل سکا  
 ذروں کو آفتاب بنانا رہا ہوں میں  
 کیا مل گیا ضمیر ہنر بیچ کر مجھے  
 اتنا کہ صرف کام چلاتا رہا ہوں میں  
 کل دوپہر عجیب سی اک بیدی رہی  
 بس تیلیاں جلا کے بجھاتا رہا ہوں میں

جی ہی جی میں وہ جل رہی ہوگی  
 چاندنی میں ٹہسل رہی ہوگی  
 چاند نے تان لی ہے چادرِ ابر  
 اب وہ کپڑے بدل رہی ہوگی  
 سو گئی ہوگی وہ شفقِ اندام  
 بنزقِ تبدیلِ جل رہی ہوگی  
 سُرخ اور بنز وادیوں کی طرف  
 وہ مرے ساتھ چل رہی ہوگی  
 پڑھتے پڑھتے کسی پہاڑی پر  
 اب وہ کروٹ بدل رہی ہوگی  
 پیڑ کی چھال سے رگڑ کھا کر  
 وہ تنے سے پھسل رہی ہوگی

نیلگوں جھیل ناف تک پہنچنے  
صندلیں جسم کل رہی ہو گی  
ہو کے وہ خوابِ عیش سے بیدار  
کتنی ہی دیر شل رہی ہو گی

خوب ہے شوق کا یہ پہلو بھی  
میں بھی برباد ہو گیا تو بھی  
حُسنِ معصوم، تمکنت میں تری  
فرق آیا نہ یک سرِ مُو بھی  
یہ نہ سوچا تھا زیرِ سایہ زلف  
کہ بچھڑ جائے گی یہ خوشبو بھی  
حُسنِ کہتا تھا، چھپڑنے والے  
چھینا ہی تو بس نہیں چھو بھی  
ہلے وہ اُس کا موج خیز بدن  
میں تو پیسا رہا لبِ جو بھی  
یاد آتے ہیں معجزے اپنے  
اور اُس کے بدن کا جادو بھی

یاسمیں اُس کی خاص محسوس راز  
 یاد آیا کرے گی اب تو بھی  
 یاد سے اُس کی ہے ہر پڑھیز  
 لے صبا اب نہ آئی تو بھی  
 ہیں یہی جون ایلینا جو کبھی  
 سخت مغرور بھی تھے بدخو بھی

تو بھی چپ ہے میں بھی چپ ہوں یہ کیسی تنہائی ہے  
 تیرے ساتھ تری یاد آئی کیسا تو سچ مچ آئی ہے  
 شاید وہ دن پہلا دن تھا پلکیں بھل ہونے کا  
 مجھ کو دیکھتے ہی جب اُس کی انکڑائی شرابی ہے  
 اُس دن پہلی بار ہوا تھا مجھ کو رفاقت کا احساس  
 جب اُس کے ملبوس کی خوشبو گھر پہنچانے آئی ہے  
 حُسن سے عرضِ شوق نہ کرنا حُسن کو زک پہنچانا ہے  
 ہم نے عرضِ شوق نہ کر کے حُسن کو زک پہنچائی ہے  
 ہم کو اور تو کچھ نہیں سوجھا البتہ اُس کے دل میں  
 سوزِ رقابت پیدا کر کے اُس کی نیند اُڑائی ہے  
 ہم دونوں مل کر بھی دلوں کی تنہائی میں بھٹکیں گے  
 پاگل کچھ تو سوچ یہ تو نے کیسی شکل بنائی ہے

عشق پیمان کی صندل پر جانے کس دن بیل چڑھے  
 کیاری میں پانی ٹھیرا ہے دیواروں پر کاتی ہے  
 حُن کے جانے کتنے چہرے حُن کے جانے کتنے نام  
 عشق کا پیشہ حُن پرستی عشق بڑا ہر جاتی ہے  
 آج بہت دن بعد میں اپنے کمرے تک آ نکلا تھا  
 جوں ہی دروازہ کھولا ہے اُس کی خوشبو آتی ہے  
 ایک تو اتنا جس ہے پھر میں سانس روکے بیٹھا ہوں  
 ویرانی نے جھاڑو دے کے گھر میں دھول اڑائی ہے

بے دل کیا یونہی دن گزر جائیں گے  
 صرف زندہ رہے ہم تو مر جائیں گے  
 رقص ہے رنگ پر رنگ ہم رقص ہیں  
 سب بچھڑ جائیں گے سب بکھر جائیں گے  
 یہ خرابا تیانِ حسدِ باختہ  
 صبح ہوتے ہی سب کام پر جائیں گے  
 کتنی دل کش ہو تم کتنا دل جو ہوں میں ہم  
 کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے  
 ہے غنیمت کہ سہرا ہستی سے ہم  
 بے خبر آتے ہیں بے خبر جائیں گے

• دیکھیں کہ بے رنگ کا نظا استعمال کرنا قطعاً جائز نہیں لہذا اگر آپ چاہیں تو پہلا مصرع اس طرح پڑھیں،  
 کتنے دل کش ہم کتنے دل جو ہیں ہم۔



بار جا لے نگاہِ ناکارہ  
 گم افق میں ہوا وہ طیارہ  
 آہ وہ محلِ فضا پر دواز  
 چاند کو لے گیا ہے ستارہ  
 صبح اُس کو وداع کر کے میں  
 نصف شب تک پھرا ہوں آوارہ  
 سانس کیا ہیں کہ میرے سینے میں  
 ہر نفس چل رہا ہے اک آرا  
 کچھ کہا بھی جو اس سے حال تو کب؟  
 جب تلافی رہی نہ کفارہ  
 کیا تھا آخر مرا وہ عشقِ عجیب  
 عشق کا خون کہ عشقِ خونِ خوارہ

تیرا زیاں رہا ہوں میں، اپنا زیاں رہوں گا میں  
 تلخ ہے میری زندگی، تلخ زباں رہوں گا میں  
 تیرے حضور، تجھ سے دُور، جلتی رہے گی زندگی  
 شعلہ بجائ رہا ہوں میں، شعلہ بجائ رہوں گا میں  
 تجھ کو تباہ کر گئے، تیری دفن کے دلولے  
 یہ میرا غم ہے میرا غم، اس میں تپاں رہوں گا میں  
 حیف نہیں ہے دیکھ بھال میری نصیب میں ترے  
 یعنی متاعِ بردہ کم نظراں رہوں گا میں  
 جاز کی دُھن اُداس ہے دل بھی بہت اُداس ہے  
 'جانے کہاں بسے گی تو جانے کہاں رہوں گا میں  
 ہم ہیں جُدا جُدا مگر فن کی بساطِ رنگ پر  
 رقص کناں رہے گی تو، زمزمہ خواں رہوں گا میں

۱۔ ناز کو جس نے اپنا حق سمجھا  
 کیا تمہیں یاد ہے وہ بے چارہ  
 ۲۔ چاند ہے آج کچھ ٹنڈھال ٹنڈھال  
 کیا بہت تھک گیا ہے ہر کارہ  
 ۳۔ اس مسلسل شبِ جدائی میں  
 خون تھوکا گیا ہے مہ پارہ  
 ۴۔ ہو گئی ہے مرے سفر کی سحر  
 کوچ کا بیج رہا ہے نشہ ارہ

ہیں عجیب رنگ کی داستاں، گنتی پل کا تو، گنتی پل کا میں  
 سو ہیں اب کہاں؟ مگر اب کہاں، گنتی پل کا تو، گنتی پل کا میں  
 نہ یقین ہیں اب، نہ گناں ہیں اب، سو کہاں تھے جب سے کہاں ہیں اب  
 وہ یقین یقین، وہ گناں گناں، گنتی پل کا تو، گنتی پل کا میں  
 مری جاں وہ پل جو گنتی نکل، کوئی پل تھی وہ کہ ازل، ازل  
 سو گذشتگی میں ہیں سبکراں، گنتی پل کا تو، گنتی پل کا میں  
 وہی کارواں ہے کہ ہے زواں وہی وصل وصل ہیں درمیاں  
 ہیں غبارِ رفته کارواں، گنتی پل کا تو، گنتی پل کا میں  
 تو مرے بدن سے جھلک بھی لے، میں تم سے بدن سے مہک بھی لیں  
 ہمہ نارسائی ہیں جانِ جاں، گنتی پل کا تو، گنتی پل کا میں  
 گلہ فراق تو کیوں بھلا طلبِ دصال تو کیا بھلا  
 کسی آگ کا تھے بس اک دھواں، گنتی پل کا تو، گنتی پل کا میں

یاد آ رہی ہے پھر تری فرمایشِ سخن  
 وہ نغمگی کہاں مری عرضِ سخن میں تھی  
 آشوبناک تھی ننگِ ادلینِ شوق  
 صبحِ وصال کی سی تھکن اُس بدن میں تھی  
 پہنچی ہے جب ہماری تباہی کی داستاں  
 عذرا وطن میں تھی نہ عنسیزو وطن میں تھی  
 میں اور پاسِ وضعِ خرد کیا ہوا مجھے؟  
 میری تو آن ہی مرے دیوانہ پن میں تھی  
 انکار ہے تو قیمتِ انکار کچھ بھی ہو!  
 یزدان سے پوچھنا یہ ادا اہرن میں تھی

رامش گروں سے داد طلبِ انجمن میں تھی  
 وہ حالتِ سکوت جو اُس کے سخن میں تھی  
 تھے دن عجب وہ کشمکشِ انتخاب کے  
 اک بات یا سمیں میں تھی اک یا سمن میں تھی  
 دم خوردگی میں اپنی غزالِ ختن تھے ہم  
 یہ جب کا ذکر ہے کہ غزالہ ختن میں تھی  
 محل کے ساتھ ساتھ میں آ تو گیا مگر  
 وہ بات شہر میں تو نہیں ہے جو بن میں تھی  
 کیوں کہ سماعتوں کو خنکِ عیش کر گئی  
 وہ تند شعلگی جو نوا کے بدن میں تھی  
 خواباں کہاں تھے نکتہِ خوبی سے بانجبر  
 یہ اہل فن کی بات تھی اد اہل فن میں تھی

خیمہ کہ نگاہ کو ٹوٹ لیا گیا ہے کیا؟  
 آج اتنی کے دوش پر گرد کی شال بھی نہیں  
 اُن یہ فضائے احتیاط، تا کہیں اڑ نہ جائیں ہم  
 بادِ جنوب بھی نہیں، بادِ شمال بھی نہیں  
 وجہ معاشِ بے دلائل، یاس ہے اب مگر کہاں  
 اُس کے دُرود کا گماں، فرضِ محال بھی نہیں  
 غارتِ روز و شب تو دیکھ، وقت کا یہ غضب تو دیکھ  
 کل تو ٹڈھال بھی تھامیں، آج ٹڈھال بھی نہیں  
 میرے زمان و ذات کا ہے یہ معاملہ کہ اب  
 صبحِ فراق بھی نہیں، شامِ وصال بھی نہیں  
 پہلے ہمارے ذہن میں حُسن کی اک مشال تھی  
 اب تو ہمارے ذہن میں کوئی مشال بھی نہیں  
 میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس  
 خود کو تباہ کر لیا اور طلال بھی نہیں

حال یہ ہے کہ خواہشِ پُرش حال بھی نہیں  
 اُس کا خیال بھی نہیں اپنا خیال بھی نہیں  
 اے شجرِ حیاتِ شوق، ایسی خزاں رسیدگی ا  
 پُرشِ بگ و گل تو کیا جسم پہ چھال بھی نہیں  
 مجھ میں وہ شخص ہو چکا جس کا کوئی حساب تھا  
 سو ہے کیا، زیاں ہے کیا، اس کا سوال بھی نہیں  
 مست ہیں اپنے حال میں دل زدگان و دلبران  
 صلح و سلام تو کجا، بحث و جدال بھی نہیں  
 تو برا حوصلہ تو دیکھ، داد تو دے کہ اب مجھے  
 شوقِ کمال بھی نہیں، خوفِ زوال بھی نہیں

لے اس مصرع میں پُرش، کا لفظ، برادرِ عزیزِ اظہر عباس ہاشمی کی دین ہے۔

یہ کچھ آسان تو نہیں ہے کہ ہم  
 روٹھتے اب بھی ہیں مروت میں  
 وہ جو تعمیر ہونے والی تھی  
 لگ گئی آگ اُس عمارت میں  
 اپنے جُڑے کا کیا بیاں کہ یہاں  
 خون تھوکا گیا شرارت میں  
 وہ خلا ہے کہ سوچتا ہوں میں  
 اُس سے کیا گفتگو ہو خلوت میں  
 زندگی کس طرح بسر ہو گی  
 دل نہیں لگ رہا محبت میں

ق

حاصلِ دکن، ہے یہ جہانِ خراب  
 یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

سرہی اب پھوڑیے ندامت ہما  
 نیند آنے لگی ہے فرقت میں  
 ہیں دیسیں ترے خلاف مگر  
 سوچتا ہوں تری حمایت میں  
 رُوح نے عشق کا فریب دیا  
 جسم کو جسم کی عداوت میں  
 اب فقط عادتوں کی درزاکش ہے  
 رُوح شامل نہیں شکایت میں  
 عشق کو درمیاں نہ لاؤ کہ میں  
 چینتا ہوں بدن کی عُشرت میں

پھر بنایا خدا نے آدم کو  
اپنی صورت پہ ایسی صورت میں  
اور پھر آدمی نے غور کیا  
چھٹکار کی لطیف صنعت میں  
اے خدا (جو کہیں نہیں موجود)  
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں

نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم  
بچھڑانا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم  
خوشی سے ادا ہو رسم دوری  
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم  
یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں  
وفاداری کا دعو کیوں کریں ہم  
دفا، احسان، قربانی، محبت  
اب ان نفلوں کا پیچھا کیوں کریں ہم  
سنا دیں عصمتِ مریم کا قصہ؟  
پر اب اس باب کو ڈا کیوں کریں ہم  
زلیخا سے عزیزیاں بات یہ ہے  
بھلا گھٹے کا سودا کیوں کریں ہم

چبالیس کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچا  
 تمہیں راتب مہیا کیوں کریں ہم  
 ۱۰ پڑی رہنے دو انسانوں کی لاشیں  
 زمیں کا بوجھ ہٹا کیوں کریں ہم  
 یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی  
 یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم

جہادی ہی تمہیں کیوں کرو تم  
 تمہاری ہی تمنا کیوں کریں ہم  
 کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے  
 تو ساری عمر ایسا کیوں کریں ہم  
 اٹھا کر کیوں نہ پھینکیں ساری چیزیں  
 فقط کمروں میں ٹھلا کیوں کریں ہم  
 جو اک نسلِ مسروماہ کو پہنچے  
 وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم  
 نہیں دنیا کو جب پروا جہادی  
 تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم  
 برہنہ ہیں سر بازار تو کیا  
 بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کریں ہم  
 ہیں باشندے اسی بستی کے ہم بھی  
 سو خود پر بھی بھروسا کیوں کریں ہم

ہے خفا مارے کارخانے سے  
ایک اسباب ناشناس مشین  
ایک پُرزا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا  
اب رکھا کیا ہے تیرے پاس مشین

ہے یہ بازار جھوٹ کا بازار  
پھر یہی جنس کیوں نہ تھیں ہم  
کر کے اک دوسرے سے عہدِ وفا  
اؤ کچھ دیر جھوٹ بولیں ہم

ہار آئی ہے کوئی آس مشین  
شام سے ہے بہت اُداس مشین  
دل دہی کس مشین سے چاہے  
ہے مشینوں سے بڑا اس مشین  
یہی رشتوں کا کارخانہ ہے  
اک مشین اور اس کے پاس مشین  
کام سے تجھ کو مس نہیں شاید  
چاہتی ہے ذرا مس اس مشین  
یہ سمجھ لو کہ جو بھی جنگلی ہے  
نہیں آتے گی اس کو اس مشین  
شہر اپنے ، بائیں گے جنگل  
تجھ میں اُگنے کو اب ہے گھاس مشین



ہاں ٹھیک ہے میں اپنی انا کا مریض ہوں سچ  
 آخر مرے مزاج میں کیوں دخل دے کوئی  
 سنا اک شخص کر رہا ہے ابھی تک وفا کا ذکر  
 کاش اس زباں دراز کا منہ نوج لے کوئی

سینہ دکھ رہا ہر تو کیا چپ رہے کوئی  
 کیوں چیخ چیخ کر نہ گلا چھیل لے کوئی  
 ثابت ہوا سکونِ دل و جاں کہیں نہیں  
 رشتوں میں ڈھونڈتا ہے تو ڈھونڈا کے کوئی  
 ترکِ تعلقات کوئی مسئلہ نہیں  
 یہ تو وہ راستہ ہے کہ بس چل پڑے کوئی  
 دیوار جانتا تھا جسے میں وہ دھول تھی  
 اب مجھ کو اعتماد کی دعوت نہ دے کوئی  
 میں خود یہ چاہتا ہوں کہ حالات ہوں خراب  
 میرے خلاف زہر اگلتا پھرے کوئی  
 اے شخص اب تو مجھ کو سبھی کچھ قبول ہے  
 یہ بھی قبول ہے کہ تجھے چھین لے کوئی

جو رعنائی نگاہوں کے لیے فردوسِ جلوہ ہے  
 لباسِ مفلسی میں کتنی بے قیمت نظر آتی  
 یہاں تو جاہلیت بھی ہے دولت ہی کی پروردہ  
 یہ لڑکی فاقہ کش ہوتی تو بد صورت نظر آتی

۷۲ ہے

کل رات بہت غمور کیا ہے سو ہم اے جو  
طے کر کے اٹھے ہیں کہ تمنا نہ کریں گے

## دو غزلہ

سوچا ہے کہ اب کارِ مسیحا نہ کریں گے  
وہ خون بھی تھوکے گا تو پردا نہ کریں گے  
اس بار وہ تلخی ہے کہ رٹھے بھی نہیں ہم  
اب کے وہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے  
یاں اُس کے سیتھے کے ہیں آثار تو کیا ہم  
اس پر بھی یہ کراتہ و بالا نہ کریں گے  
اب نغمہ طرازانِ برفروختہ اے شہرا  
واسوخت کہیں گے غزلِ آشنا نہ کریں گے  
ایسا ہے کہ سینے میں سلگتی ہیں خراشیں  
اب سانس بھی ہم لیں گے تو اچھا نہ کریں گے

اخلاق نہ بتیں گے مُدارا نہ کریں گے  
اب ہم بھی کسی شخص کی پردا نہ کریں گے  
کچھ لوگ کئی لفظ غلط بول رہے ہیں  
اصلاح مگر ہم بھی اب اصلا نہ کریں گے  
کم گوئی کہ اک وصفِ حماقت ہے بہر طور  
کم گوئی کو اپنائیں گے چمکا نہ کریں گے  
اب سہل پسندی کو بنائیں گے وتیرہ  
تاویر کسی باب میں سوچا نہ کریں گے  
غصہ بھی ہے تہذیبِ تعلق کا طلب گار  
ہم چپ ہیں بھرے بیٹھے ہیں غصہ نہ کریں گے

تھی اک عجب فضا سی امکانِ خال و خد کی  
 تھا اک عجب مصدر اور وہ مرا گماں تھا  
 عمریں گزر گئی تھیں ہم کو یقیں سے بچھڑے  
 اور لمحہ اک گماں کا، صدیوں میں بے اماں تھا  
 جب ڈوبتا چلا میں تاریکیوں کی تہ میں  
 تہ میں تھا اک دیکھ اور اُس میں آسماں تھا

جانے کہاں گیا وہ، وہ جو ابھی یہاں تھا؟  
 وہ جو ابھی یہاں تھا، وہ کون تھا، کہاں تھا؟  
 تا لمحہ گزشتہ یہ جسم اور سایے  
 زندہ تھے رایگاں میں، جو کچھ تھا رایگاں تھا  
 اب جس کی دید کا ہے سودا ہمارے سر میں  
 وہ اپنی ہی نظر میں اپنا ہی اک سماں تھا  
 کیا کیا نہ خون تھوکا میں اُس گلی میں یارو  
 سچ جانا وہاں تو جو فن تھا رایگاں تھا  
 یہ حوا کر گیا ہے پہلو سے کون مجھ پر؟  
 تھا میں ہی دائیں بائیں اور میں ہی درمیاں تھا  
 اُس شہر کی حفاظت کرنی تھی ہم کو جس میں  
 اڑھی کی تھیں فصیلیں اور گرد کا مکاں تھا

کون ہے مجھ میں شعلہ بجاں  
شعلہ بجاں ہوں میں یا میں  
آگ ، مرے ہونے کی آگ  
تیرا دھواں ہوں میں یا میں

جانے یہاں ہوں میں یا میں  
اپنا گماں ہوں میں یا میں  
میری دوتی ہے میرا نیاں  
اپنا نیاں ہوں میں یا میں  
جانے کون تھا وہ یا وہ  
جانے کہاں ہوں میں یا میں  
ہر دم اپنی زد پر ہوں  
جاے اناں ہوں میں یا میں  
میں جو ہوں اک حیرت کا سماں  
کیا وہ سماں ہوں میں یا میں

جاناں جان تری حسرت میں، رات بھلا کیسے گزرے گی  
 مارا دن حسرت میں گزارا، اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا  
 اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا، سینہ خالی کر ڈالا ہے  
 لے میں اپنے سانس بھی ہارا، اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا

کون سود و زیاں کی دنیا میں  
 دردِ غربت کا ساتھ دیتا ہے  
 جب مقابل ہوں عشق اور دولت  
 حُسنِ دولت کا ساتھ دیتا ہے

دل ہے سُوالی تجھ سے دل آرا، اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا  
 آس ہے تیری ہی دل دارا، اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا  
 پلکوں کی جھولی پھیلی ہے، پڑ جائیں اس میں کچھ کریں  
 تو ہے دل آکاش کا تارا، اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا  
 ایک صندا ہونٹوں پر لے کے، تیری گلی میں شام ہونے سے  
 آٹھلا ہے اک بے چارہ، اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا  
 تیرے ہی در کے ہم ہیں سُوالی، تیرا ہی در دل میں کھلا ہے  
 شہرِ نظر در بند ہے سارا، اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا  
 تیرا تمنا رکھتا ہے، ایک نظر دیدار، تمنا  
 ساجن پیارے، میرا پیارا، اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا

جنوں کریں ہوسِ ننگ و نام کے نہ رہیں  
 مگر نہ یوں ہو کہ ہم اپنے کام کے نہ رہیں  
 زیاں ہے اُس کی رفاقت کہ اُس کے دوش پر دوش  
 چلیں تو منظرِ حُرُنِ خرام کے نہ رہیں  
 کہاں ہے وصل سے بڑھ کر کوئی عطا لیکن  
 یہ خوب ہے کہ پیامِ دِ سلام کے نہ رہیں  
 نصیب ہو کوئی دم وہ معاشِ حال کہ ہم  
 حسابِ سلسلہ صبح و شام کے نہ رہیں  
 یہ بات بھی ہے کہ لمحوں کے لوگ جائیں کہاں  
 اگر فریبِ بقائے دوام کے نہ رہیں  
 خدا نہیں ہے تو کیا حق کو چھوڑ دیں ایسے شیخ  
 غضبِ خدا کا ہم اپنے امام کے نہ رہیں

ہے فصیلیں اٹھا رہا مجھ میں  
 جانے یہ کون آ رہا مجھ میں  
 جوآن مجھ کو جلا وطن کر کے  
 وہ مرے بن بھلا رہا مجھ میں  
 مجھ سے اُس کو رہی تلاشِ امید  
 سو بہت دن چھپا رہا مجھ میں  
 تھا قیامت، سکوت کا آثوب  
 حشر سا اک بسپا رہا مجھ میں  
 پس پردہ کوئی نہ تھا پھر بھی  
 ایک پردہ کھنچا رہا مجھ میں

لے میرے شاعر دوستوں کو میری یہ روایت بہت پسند آئی چنانچہ انہوں نے اس میں خوب غزلیں کہاں  
 جنوں

تو مری شاعری میں ہے رنگ طراز و گل قشاں  
 تیری بہار بے فزاں، شام بخیر شب بخیر  
 تیرا خیال خواب خوابِ غلوتِ جاں کی آبِ دُتاب  
 جسم جمیل و نوجواں، شام بخیر شب بخیر  
 ہے مرا نامِ ارجمند تیرا حصارِ سر بلند  
 بانو شہرِ جسم و جاں، شام بخیر شب بخیر  
 دید سے جاں دید تک دل سے رُخ امید تک  
 کوئی نہیں ہے درمیاں، شام بخیر شب بخیر  
 ہو گئی دیر جاؤ تم مجھ کو گلے لگاؤ تم  
 تو مری جاں ہے میری جاں، شام بخیر شب بخیر  
 شام بخیر شب بخیر، موجِ شمیمِ پیرین  
 تیری ہمک لے گی یاں، شام بخیر شب بخیر

## (زاہدہ خا کے نام)

جاؤ قرار بے دلاں! شام بخیر شب بخیر  
 صحن ہوا دھواں دھواں، شام بخیر شب بخیر  
 شامِ دھال ہے قریب صبحِ کمال ہے قریب  
 پھر نہ رہیں گے سرگراں، شام بخیر شب بخیر  
 وجد کرے گی زندگی جسم بہ جسم جاں بہ جاں  
 جسم بہ جسم جاں بہ جاں، شام بخیر شب بخیر  
 اے مرے شوق کی انگ میرے شباب کی تنگ  
 تجھ پہ شفق کا سایاں، شام بخیر شب بخیر

لے، میری اس زمین میں بھی میرے قدم دانوں نے غزلیں کہہ کر مجھے نوازا اور خوب

ہے تو بارے یہ عالم اسباب  
 بے سبب چھیننے لگا کیجے  
 آج ہم کیا گلہ کریں اس سے؟  
 گلہ تنگیِ قبا کیجے  
 نطقِ حیوان پر گراں ہے ابھی  
 گفتگو کم سے کم کیا کیجے  
 حضرت زلفِ غالبہ انشاں  
 نام اپنا صبا صبا کیجے  
 زندگی کا عجب معاملہ ہے  
 ایک لمحے میں فیصلہ کیجے  
 مجھ کو عادت ہے روٹھ جانے کی  
 آپ مجھ کو منا لیا کیجے  
 ملتے رہیے اسی تپاک کے ساتھ  
 بیرونی کی انتہا کیجے

کس سے اظہارِ دعا کیجے  
 آپ ملتے نہیں ہیں کیا کیجے  
 ہونہ پایا یہ فیصلہ اب تک  
 آپ کیا کیجیے تو کیا کیجے  
 آپ تھے جس کے چارہ گروہ جواں  
 سخت بیمار ہے دعا کیجے  
 ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے  
 جس سے طے اُسے خفا کیجے  
 ہے تقاضا مری طبیعت کا  
 ہر کسی کو چہرا غ پاجیجے



کو کہن کو ہے خودکشی خواہش  
شاہ بانو سے التجا کیجے

مجھ سے کہتی تھیں وہ ثراب آئیں  
آپ وہ زہر مت پیا کیجے  
رنگ ہر رنگ میں ہے واو طلب  
خون تھوکوں تو واہ وا کیجے

گا ہے گا ہے بس اب یہی ہو کیا  
تم سے مل کر بہت خوشی ہو کیا  
بل رہی ہو بڑے تپاک کے ساتھ  
مجھ کو بکیر بھلا چکی ہو کیا  
یاد ہیں اب بھی اپنے خواب تمہیں  
مجھ سے مل کر اداس بھی ہو کیا  
بس مجھے یونہی اک خیال آیا  
سوچتی ہو تو سوچتی ہو کیا  
اب مری کوئی زندگی ہی نہیں  
اب بھی تم میری زندگی ہو کیا  
کیا کس عشق جاودانی ہے !  
آخری بار بل رہی ہو کیا

یہ تیرے خط تری خوشبو یہ تیرے خواب و خیال  
متار جاں ہیں ترے قول اور قسم کی طرح  
گذشتہ سال انہیں میں نے گن کے رکھا تھا  
کسی غریب کی جوڑی ہوئی رستم کی طرح

ہاں فضا یاں کی سوئی سوئی سی ہے  
 تو بہت تیز روشنی ہو کیسا  
 میرے سب طنز بے اثر ہی ہے  
 تم بہت دُور جا چکی ہو کیسا  
 دل میں اب سوزِ انتظار نہیں  
 شمعِ اُمید بجھ گئی ہو کیسا  
 اس سمندر پہ تشنہِ کام ہوں میں  
 بان ، تم اب بھی بہہ رہی ہو کیسا

منظر سا تھا کوئی کہ نظر اُس میں گم ہوئی  
 سمجھو کہ خواب تھا کہ سحر اُس میں گم ہوئی  
 سو دلے رنگ وہ تھا کہ اُترا خود اپنا رنگ  
 پھر یہ کہ ساری جنسِ ہُنر اُس میں گم ہوئی  
 وہ میرا اک گمان کہ منزل تھا جس کا نام  
 ساری متاعِ شوقِ سفر اُس میں گم ہوئی  
 دیوار کے سوا نہ رہا کچھ دلوں کے بیچ  
 ہر صورتِ کشائشِ دُر اُس میں گم ہوئی  
 لائے تھے رات اُس کی خبر قاصدِ دل  
 دل میں وہ شور اٹھا کہ خبر اُس میں گم ہوئی

اک فیصلے کا سانس تھا اک عمر کا سفر  
 لیکن تمام راگنڈر اُس میں گم ہوئی  
 بس جَوَن کیا کہوں کہ مری ذاتِ نفع جو  
 جس کام میں یہاں تھا ضرر اُس میں گم ہوئی

وہ زلف ہے پریشاں، ہم سب اُدھر چلے ہیں  
 تم بھی چلو کہ سارے آشفتمے سر چلے ہیں  
 تم بھی چلو غنزالاں، کوئے غزال چشماں  
 درشن کا آج دن ہے سب خوش نظر چلے ہیں  
 رنگ اس گلی خزاں کے موسم میں کھیلنے کو  
 خونیں دلاں گتے ہیں خونیں جسگر چلے ہیں  
 اب دیر مت لگا چل، اے یار بس چلا چل  
 دیکھیں یہ خوش نشیناں آخر کدھر چلے ہیں  
 بس اب پہنچ چکے ہم یاراں سوے بیاباں  
 ساتھ اپنے ہم کو لے کر دیوارِ دُور چلے ہیں

سر میں تکمیل کا تھا اک سودا  
 ذات میں اپنی تھا اُدھورا میں  
 کیا کہوں تم سے کتنا نادام ہوں  
 تم سے مل کر ہوا نہ پورا میں

دنیا تباہ کر کے ہوش آگیا ہے دل کو  
اب تو ہماری سن لو اب ہم سُدر چلے ہیں  
ہے سلسلہ عجب کچھ اُس خلوق سے اپنا  
سب اُس کے گھر چلے ہیں ہم اپنے گھر چلے ہیں

خود سے ہر دم ترا سفر چاہوں  
تجھ زبانی تری خبر چاہوں  
میں تجھے اور تو ہے کیا کیا کچھ  
ہوں اکیسلا پہ رات بھر چاہوں  
مجھ سے میرا سراغ کیوں کہ یہ کام  
میں ترے نقش پا کے سر چاہوں  
خون گرم اپنا پارچے اپنے  
میں خود اپنی ہی میز پر چاہوں  
ہیں بیاباں مری درازوں میں  
کیوں بگولے برہنہ سر چاہوں  
مجھ کو گسٹائی میں اتنا ہے  
پر میں گہرائی سطح پر چاہوں

یوں تو اپنے قاصدانِ دل کے پاس  
جانے کس کس کے لیے پینام ہیں  
جو لکھے جاتے رہے اوروں کے نام  
میرے وہ خط بھی تمہارے نام ہیں

کام کیا چیز ہے کہ نام بھی میں  
 کام کے نام پر نہ کر چاہوں  
 اک نظر ڈالنی ہے منظر پر  
 لکھشائیں کمر کمر چاہوں  
 ضد ہے زخموں میں بیر جذبوں میں  
 میں کئی دل کئی جگر چاہوں  
 اب تو اس سوچ میں ہوں سرگراں  
 کیا میں چاہوں بھلا اگر چاہوں

سرکار! اب جنوں کی ہے سرکار کچھ سُنا  
 ہیں بند سائے شہر کے بازار کچھ سُنا  
 شہرِ قلمندراں کا ہوا ہے عجیب طو  
 سب ہیں جہاں پناہ سے بیزار کچھ سُنا  
 مصروف کوئی کاتبِ غیبی ہے روز و شب  
 کیا ہے بھلا نوشتہ دیوار کچھ سُنا  
 آثار اب یہ ہیں کہ گریبانِ شاہ سے  
 ابھیس گئے ہاتھ برسرا دربار کچھ سُنا  
 اہلِ ستم سے معرکہ آرا ہے اک ہجوم  
 جس کو نہیں بلا کوئی سردار کچھ سُنا

خونیں دلائنِ حرسہ امتحان نے آج  
 کیا تمکنت دکھائی سرِ دار کچھ سُنا  
 کیا لوگ تھے کہ رنگ بچاتے چلے گئے  
 رفتار تھی کہ خون کی رفتار کچھ سُنا

نام ہی کیا نشاں ہی کیا خواب و خیال ہو گئے  
 تیری مثال دے کے ہم تیری مثال ہو گئے  
 مایہ ذات سے بھی رُم، عکسِ صفات سے بھی رُم  
 دشتِ غزل میں آ کے دیکھ ہم تو غزال ہو گئے  
 کتنے ہی نشہ ہائے ذوق، کتنے ہی جذبہ ہائے شوق  
 رُم تپاکِ یار سے رُو بہ زوال ہو گئے  
 عشق ہے اپنا پایدار، اُس کی وفا ہے استوار  
 ہم تو ہلاکِ درزشِ فرضِ محال ہو گئے  
 کیسے زمیں پرست تھے عہدِ وفا کے پاس دار  
 اڑ کے بلندیوں میں ہم، گردِ ملال ہو گئے  
 قربِ جمال اور ہم، عیشِ وصال اور ہم؟  
 ہاں میرے ہوا کہ ساکنِ شہرِ جمال ہو گئے

ہر طنز کیا جائے، ہر اک طعنہ دیا جائے  
 کچھ بھی ہو پر اب حدِ ادب میں نہ رہا جائے  
 تاریخ نے قوموں کو دیا ہے یہی پیغام  
 حق مانگنا تو یہی ہے حق چھین لیا جائے

جادۂ شوق میں پڑا قحطِ غبارِ کارواں  
 واں کے شجر تو سر بہ سر دستِ سوال ہو گئے  
 کون سا قافلہ ہے یہ، جس کے جس کا ہے یہ شور  
 میں تو نڈھال ہو گیا، ہسم تو نڈھال ہو گئے  
 خار بہ خار گل بہ گل، فصلِ بہار آگئی  
 فصلِ بہار آگئی، زحمتِ مجال ہو گئے  
 شور اٹھا مگر تجھے لذتِ گوشت تو ملی  
 خون بہا مگر ترے ہاتھ تو لال ہو گئے  
 ہم نفسانِ وضع دار، مستمعانِ بُردبار  
 ہم تو تمہارے واسطے ایک وبال ہو گئے  
 جَوَن کر دو گے کب تک اپنا مثالیہ تلاش  
 اب کئی ہجر ہو چکے، اب کئی سال ہو گئے

کسی سے عہد و پیمانہ کر نہ رہیو  
 تو اس بستی میں رہیو پر نہ رہیو  
 سفر کرنا ہے آخر دو پاک بیچ  
 سفر لمبا ہے بے بستر نہ رہیو  
 ہر اک حالت کے بیری ہیں یہ لمحے  
 کسی غم کے بھروسے پر نہ رہیو  
 سہولت سے گزر جاؤ مری جاں  
 کہیں جینے کی خاطر مرنہ رہیو  
 ہمارا عسر بھر کا ساتھ ٹھیرا  
 سو میرے ساتھ تو دن بھر نہ رہیو  
 بہت دشوار ہو جائے گا جینا  
 یہاں تو ذات کے اندر نہ رہیو

سویرے ہی سے گھر آجائو آج  
ہے روزِ واقعہ باہر نہ رہیو  
کہیں چھپ جاؤ تہ خانوں میں جا کر  
شبِ فتنہ ہے اپنے گھر نہ رہیو  
نظر پر بار ہو جاتے ہیں منظر  
جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو

زیرِ محرابِ ابرواں خوں ہے  
از زمیں تا بہ آسماں خوں ہے  
ایک سہل کا رقصِ رنگ تھا آج  
سرِ مقل جہاں تہاں خوں ہے  
زخم کے حسرمنوں کا مژدہ ہو  
آبِ کشتِ بلا کشاں خوں ہے  
سادہ پوشانِ عیدِ شوق ، نید  
آبِ حوضِ نمازیں خوں ہے  
خوب ہے حسرتوں کی محنت گاہ  
دلِ یارانِ خے فناں خوں ہے



اُس طرف کو کہن ادھر شیریں  
اور دونوں کے درمیاں نوحں ہے  
بے دلوں کو نہ چھیڑو کہ یہ قوم  
امتِ شوقِ رایگاں نوحں ہے

زخمِ انگیز ہے فراشیں امید  
مے دیدارِ گلِ رھاں نوحں ہے  
ہو گئے باریاب اہلِ غرض  
روے دلہیز و آستاں نوحں ہے  
دلِ خونیں ہے میزباں اپنا  
عمدہ خوانِ میزباں نوحں ہے  
فصل آئی ہے رنگِ مستوں کی  
تابہ دیوارِ گستاں نوحں ہے  
ہر تماشائی مدعیِ ٹھیسرا  
پر تو زخمِ نوحں چکاں نوحں ہے  
رہیں بے داغ دہنساں محتاط  
نفسِ نوحں گرفتگاں نوحں ہے  
غنجیہ ہا زحسم، زخمہا الماس  
شبہمِ باغِ امتحان نوحں ہے

ہوا ہے وقت کہیں سے علیم کو لاؤ  
ہے ایک شخص جو کبکبت یار یاراں ہے  
فراق یار کو ٹھیرا لیا ہے عذر ہوس  
کوئی بتاؤ یہی رسم سوگواراں ہے؟

میں نے ہر بار تجھ سے ملتے وقت  
تجھ سے ملنے کی آرزو کی ہے  
تیرے جانے کے بعد بھی میں نے  
تیری خوشبو سے گفتگو کی ہے

غبارِ محلِ گل پر ہجومِ یاراں ہے  
کہ ہر نفس، نفسِ آخر بہاراں ہے  
بتاؤ وجد کروں یا لبِ سخن کھولوں  
ہوں مستِ راز اور انہو رازداراں ہے  
مٹا ہوا ہوں شبابہت پہ نامداروں کی  
تباہ ہوں کہ یہی وضعِ نامداراں ہے  
چلا ہوں پھر سرِ کوسے دراز مڑگاناں  
مرا ہنر، ہنرِ زخمِ تازہ داراں ہے  
یہی ہے وقت کہ آغوشِ وارِ قص کروں  
سرورِ نیمِ شبی ہے صفِ نگاراں ہے

شکر سا اک دیکھ ہو نشہ سا اک سکوت  
 ہو شام اک شراب سی اور لڑکھڑاؤں میں  
 پھر اُس گلی سے اپنا گزر چاہتا ہے دل  
 اب اُس گلی کو کونسی بستی سے لاؤں میں

تجھ سے گلے کروں تجھے جاناں منساؤں میں  
 اک بار اپنے آپ میں آؤں تو آؤں میں  
 دل سے ستم کی بے سروکاری ہوا کو ہے  
 وہ گرد اڑ رہی ہے کہ خود کو گنواؤں میں  
 وہ نام ہوں کہ جس پہ ندامت بھی اب نہیں  
 وہ کام ہیں کہ اپنی حُبدائی کماؤں میں  
 کینز بکر ہو اپنے خواب کی آنکھوں میں دلپسی  
 کس طور اپنے دل کے زمانوں میں جاؤں میں  
 اک رنگ سی کمان ہو خوشبو سا ایک تیر  
 مرہم سی واردات ہو اور زخم کھاؤں میں

پاس رہ کر جدائی کی تجھ سے  
 دور ہو کر تجھے تلاش کیا  
 میں نے تیرا نشان گم کر کے  
 اپنے اندر تجھے تلاش کیا

ہم خود آزار تھے سو لوگوں کو  
آزماتے چلے گئے ہوں گے  
ہم جو دنیا سے تنگ آئے ہیں  
تنگ آتے چلے گئے ہوں گے

ہم جو گاتے چلے گئے ہوں گے  
زخم کھاتے چلے گئے ہوں گے  
تھام بار بار کا بلینا  
لوگ بھاتے چلے گئے ہوں گے  
دور تک باغ اُس کی یادوں کے  
لہلاتے چلے گئے ہوں گے  
دشتِ آشفنگی میں خاک بسر  
خاک اڑاتے چلے گئے ہوں گے  
فکر اپنے شرابیوں کی نہ کر  
لاکھڑاتے چلے گئے ہوں گے

اُس کے اور اپنے درمیان میں اب  
کیا ہے بس روبرو کا رشتہ ہے  
ہاے وہ رشتہ ہاے خاموشی  
اب فقط گفتگو کا رشتہ ہے

کس شاہراہ پر ہوں رواں میں بہ صد شہاب  
اندازِ پا درست ہے اور سر ہے گم یہاں  
ہیں صفحہ وجود پہ سطریں کھینچی ہوئی  
دیوار پڑھ رہا ہوں مگر در ہے گم یہاں

کیا بتاؤں کہ سہمہ رہا ہوں میں  
کرب خود اپنی بے وفائی کا  
کیا میں اس کو تری تلاش کہوں؟  
دل میں اک شوق ہے جدائی کا

پہنائی کا مکان ہے اور در ہے گم یہاں  
راہِ گریز پائی صرصر ہے گم یہاں  
وسعت کہاں کہ سمت و جہت پرورش کریں  
بالیں کہاں سے لائیں کہ لیٹنے ہے گم یہاں  
ہے ذات کا وہ زخم کہ جس کا شگافِ رنگ  
سینے سے دل تک ہے پہنچتا ہے گم یہاں  
بس طور کچھ نہ پوچھ مری بود و باش کا  
دیوار و در ہیں حیب میں اور گھر ہے گم یہاں  
بیرونِ ذات کیسے ہے صد ماجرا فردش  
وہ اندرونِ ذات جو اندر ہے گم یہاں

سفر درپیش ہے اک بے مسافت  
 مسافت ہو تو کوئی فاصلہ نہیں  
 ذرا بھی مجھ سے تم غافل نہ رہو  
 میں بے ہوشی میں بھی بے باجراتیں  
 دکھ اُس کے ہجر کا اب کیا بتاؤں  
 کہ جس کا وصل بھی تو بے گلہ نہیں  
 ہیں اُس قامت سوا بھی کتنے قامت  
 پر اک حالت ہے جو اُس کے سوانتیں  
 محبت کچھ نہ تھی جُز بدحواسی  
 کہ وہ بسندِ قباہم سے کھلائیں  
 وہ خوشبو مجھ سے بچھڑی تھی یہ کہہ کر  
 منانا سب کو پر آب رُوٹھنا نہیں

## دوغزلہ

مرا اک مشورہ ہے التجا نہیں  
 تو میرے پاس سے اس وقت جائیں  
 کوئی دم چین پڑ جاتا مجھے بھی  
 مگر میں خود سے دم بھر کو جُدا نہیں  
 میں خود سے کچھ بھی کیوں منوا رہا ہوں  
 میں یاں اپنی طرف بھیجا ہوا نہیں  
 پتا ہے جانے کس کا نام میرا  
 مرا کوئی پتا میرا پتا نہیں

۱۔ 'نہیں کی اس قدیم شکل کا بیسویں صدی میں 'نیں نے ایجاد کیا، اس کے بعد متعدد دوکستوں نے  
 میں غزلیں کہیں۔ جوآن

جدائی اپنی بے رُوداد سی تھی  
 کہ میں رویا نہ تھا اور پھر ہنسائیں  
 وہ ہجر و وصل تھا سب خواب در خواب  
 وہ سارا ماجرا جو تھا وہ تھا نہیں  
 بڑا بے آسرا پن ہے سو چُپ رہ  
 نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نہیں

یہاں معنی کا بے صورت صلا نہیں  
 عجب کچھ میں نے سوچا ہے لکھائیں  
 ہیں سب اک دوسرے کی جستجو میں  
 مگر کوئی کسی کو بھی ملا نہیں  
 ہمارا ایک ہی تو دعاً تھا  
 ہمارا اور کوئی دعاً نہیں  
 کبھی خود سے نگر جانے میں کیا ہے  
 میں دستاویز پر لکھا ہوا نہیں  
 یہی سب کچھ تھا جس دم وہ یہاں تھا  
 چلے جانے پہ اس کے جانے کیا نہیں  
 بھڑکے جان تیرے آستان سے  
 لگایا جی بہت پر جی لگائیں

دستک دینے والے بھی تھے دستک سننے والے بھی  
 تھا آباد محلہ سارا ہر دروازہ زندہ تھا  
 پیلے پتوں کو سہ پہر کی وحشت پُرسہ دیتی تھی  
 آنگن میں اک اوندھے گھڑے پر بس اک کوا زندہ تھا

اب وہ گھر اک ویرانہ تھا بس ویرانہ زندہ تھا  
 سب آنکھیں دم توڑ چکی تھیں اور میں تنہا زندہ تھا  
 ساری گلی سنان پڑی تھی بادِ فنا کے پہرے میں  
 ہجر کے دالان اور آنگن میں بس اک سایہ زندہ تھا  
 وہ جو کبوتر اُس موکھے میں رہتے تھے کس دیس اُٹے  
 ایک کا نام نوازندہ تھا اور اک کا بازندہ تھا  
 وہ دوپہر اپنی مُنصحت کی ایسا دھوکا تھی!  
 اپنے اندر اپنی لاش اُٹھائے میں جھوٹا زندہ تھا  
 تھیں وہ گھر راتیں بھی کمانی، وعدے اور پھر دن گننا  
 آتا تھا جانے والے کو، جانے والا زندہ تھا

تھی جو وہ اک تمثیلِ ماضیِ آخری منظر اُس کا یہ تھا  
 پہلے اک سایہ سانگل کے گھر سے باہر آتا ہے  
 اس کے بعد کئی سایے سے اس کو نصحت کہتے ہیں  
 پھر دیواریں ڈھے جاتی ہیں دروازہ گر جاتا ہے



واہ اُن بستیوں کے سناٹے  
سب قصیدے ہماری شان میں تھے  
آسمانوں میں گر پڑے یعنی  
ہم زمیں کی طرف اڑان میں تھے

ہم کو سودا تھا سر کے مان میں تھے  
پاؤں پھسلا تو آسمان میں تھے  
ہے ندامت لہو نہ رویا دل  
زخم دل کے کسی چٹان میں تھے  
میرے کتنے ہی نام اور ہمنام  
میرے اور میرے درمیان میں تھے  
میرا خود پر سے اعتماد اٹھا  
کتنے وعدے مری اٹھان میں تھے  
یادِ ایامِ اکِ زمانے میں  
ہم کسی یاد کی امان میں تھے  
تھے عجب دھیان کے درو دیوار  
گرتے گرتے بھی اپنے دھیان میں تھے

دردِ مسدّدانِ کوسےِ دلداری  
گئے غارت جہاں تہاں جاناں  
اب بھی جھیلوں میں عکس پڑتے ہیں  
اب بھی نیلا ہے آسماں جاناں  
ہے جو پُرخوں تمہارا عکسِ خیال  
زخم آئے کہاں کہاں جاناں

ہم کہاں اور تم کہاں جاناں  
ہیں کئی ہجر درمیاں جاناں  
رایگاں وصل میں بھی وقت ہوا  
پر ہوا خوب رایگاں جاناں  
میرے اندر ہی تو کہیں گم ہے  
کس سے پچھوں ترا نشان جاناں  
عالمِ بیکرانِ رنگ ہے تو  
تجھ میں ٹھیروں کہاں کہاں جاناں  
میں ہواؤں سے کیسے پیش آؤں  
یہی موسم ہے کیا وہاں جاناں؟  
رودشنی بھر گئی نگاہوں میں  
ہو گئے خواب بے اماں جاناں

رقص جاں میں ہیں زخمِ ایجابِ سامان  
 سرِ کوسے دراز مژگاناں  
 اب نہیں حالِ سینہ کوبی کا  
 آؤ سینے سے آ لگو جاناں  
 میرا حق تو یہ تھا کہ گردِ مرے  
 ہو اک انبوہِ نارِ پستاناں  
 اپنی ورزش کے دھیان ہی سے ہمیں  
 مار رکھتے ہیں صنلیں راناں  
 ہاے وہ نارسائیاں جو گئیں  
 بحسابِ مزاجِ درباناں  
 داغِ سینے کے کچھ ہنر تو نہ تھے  
 وائے برسختہ گریباناں

ہے رنگِ ایجابِ دل میں اور زخمِ ایجابِ بھی ہے  
 یعنی جاناں دل کا تقاضا داد بھی ہے فریاد بھی ہے  
 تیشہ ناز نے میری انا کے خون کی قبا پہنائی مجھے  
 میں جو ہوں میں پرویز ہوں ایسا جو عالم فریاد بھی ہے  
 منحصر اس کی نشا پر ہے کس طور اس سے پیش آؤں  
 قیدِ مری بانہوں میں ہو کر وہ قاتلِ آزاد بھی ہے  
 جہن جدا تو رہنا ہو گا تجھ کو اپنے یاروں بیچ  
 یار ہی تو یاروں کا نہیں ہے یاروں کا استاد بھی ہے  
 ساری رویضیں بھی حاضر ہیں پھر ساری ترکیبیں بھی  
 اور تمہیں کیا چاہیے یارو، حاصلِ میری داد بھی ہے

کر عجب، گر ہو ایک لمحہ عیش  
 حاصلِ عمرِ لمحہ مہماناں  
 نہ گتے تاحسبِ رنگ کبھی  
 خون روتے رہے تن آساناں  
 وصل تو کیا، نہیں نصیب ہمیں  
 اب تمہارا سراق تک جاناں

شکل بھی اک رنگ کی ہو، رنگ کی شب، ہم نفسو  
 شوق کا وہ رنگ بدن آئے گا کب، ہم نفسو  
 جب وہ دل و جان ادا ہو گا یہاں نشہ فزا  
 میری ادائیں بھی ذرا دیکھیو تب، ہم نفسو  
 تم سے ہو وہ عذر کناں، مجھ سے ہو وہ شکوا کناں  
 اور میں خود مست رہوں، بات ہے جب، ہم نفسو  
 شعلہ لبی سے ہے سخن، معنی بالائے سخن  
 اور سخن سوز بھی ہے شعلہ لب، ہم نفسو  
 آج ہے سوچو تو ذرا، کس کی یہاں منتظری  
 رقصِ طرب ہم نفسو، شورِ طرب، ہم نفسو  
 اُس کو مری دید کا اک طور کہو، کچھ بھی کہو  
 کیا کہوں میں، کیسے کہوں، ہے وہ عجب، ہم نفسو

نیم شبی کی ہے فضا، ہم بھی ابھی ہوش میں ہیں  
اُس کو جو آنا ہے تو پھر آئے بھی اب، ہم نفسو  
اپنے سے ہر پہل ہیں پرے، ہم ہیں کہاں اپنے لئے  
کیسی تمت نفسی، کس کی طلب، ہم نفسو

دل جان! وہ آ پہنچا، درہم شکنِ دلہا  
درہم شکنِ دلہا برہم زینِ محفلہا  
یہ نغمہ سماعت کر لے مطربِ کج نغمہ  
ہے نعرہ یا قاتل در حلقہٴ بسملہا  
ہے شام سے بے قابو وہ حجر گیسالِ آشوب  
لو آہی گیا کافر لے مجمعِ غافلہا  
گردابِ عبث میں ہم اُس موج پہ ماں ہیں  
جو موج کہ یاراں ہے دورِ منگنِ ساحلہا  
ہم نادرہ جوئیاں کو وہ راہِ خوش آئی ہے  
جو آبلہ پرور ہے بے مرہمِ منزلہا

ہم اُس کے ہیں اے یاراں اس کے ہیں جو ٹھیرا ہے  
آشوب گر جانسا دیوانہ گر دلسا  
مجنوں پس مجنوں ہے بے شورِ فغاں اے وا  
محل پس محل ہے بے سیلی محلما

بھٹکتا پھر رہا ہوں جستجو بن  
سرایا آرزو ہوں آرزو بن  
کوئی اس شہر کو تاراج کر دے  
ہوتی ہے میری وحشت طے وہو بن  
یہ سب معجزاتی کی ہوس ہے  
رؤگر آئے ہیں تارِ رفو بن  
معاشِ بے دلاں پوچھو نہ یارو  
نمُو پاتے رہے رزقِ نمُو بن  
گزار اے شوقِ ابِ خلوت کی راتیں  
گزارش بن گلہ بن گفتگو بن

اُس سراپا دف کی فرقت میں  
 خواہشِ غیر کیوں ستاتی ہے  
 آپ اپنے سے ہم سخن رہنا  
 ہمیشہ! سانس پھول جاتی ہے  
 کیا ستم ہے کہ اب تری صوت  
 غور کرنے پہ یاد آتی ہے  
 کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے  
 روزِ اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

ایک ہی مژدہ صبح لاتی ہے  
 دھوپ آہنگن میں پھیل جاتی ہے  
 رنگِ موسم ہے اور بادِ صبا  
 شہر کوچوں میں خاک اڑاتی ہے  
 فرش پر کاغذ اڑتے پھرتے ہیں  
 میز پر گردِ جمستی جاتی ہے  
 سوچتا ہوں کہ اس کی یاد آئندہ  
 اب کے رات بھر جگاتی ہے  
 میں بھی اذینِ نواگری چاہوں  
 بے دلی بھی تو لب ہلاتی ہے  
 سو گئے پیڑ جاگ اٹھی خوشبو  
 زندگی خواب کیوں دکھاتی ہے

طغیانِ رنگ دیکھیے اُس لالہ رنگ کا  
 پیش از دُرود، کوچہ و بازار سُرخ ہیں  
 بمل ہیں جوشِ مستی حالت میں سینہ کوب  
 وہ رقص میں ہے اور درو دیوار سُرخ ہیں

کنہ ہی کیا کہ شرخ کے رخسار سُرخ ہیں  
 جب حرفِ شوخ سے لبِ گفتار سُرخ ہیں  
 ناداریِ نگاہ ہے اور زردِ منظری  
 حسرت یہ رنگ کی ہے جو نادار سُرخ ہیں  
 اب اُس متاعِ رنگ کا اندازہ کیجیے  
 شوقِ طلب سے جس کے خریدار سُرخ ہیں  
 ہے بند و بستِ لطفِ مغال، رنگ کھیلے  
 میخانہ سُرخ ہے مے و میخوار سُرخ ہیں  
 جا بھی فقیہِ سبز قدم، اب یہاں سے جا  
 میں تیری بات پی گیا پُر یاد سُرخ ہیں

یہ تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے میعادِ ستم  
 بُوڑ حریفانِ ستم کس کو پکارا جائے  
 وقت نے ایک ہی نکتہ تو کیا ہے تعلیم  
 حاکمِ وقت کو بسند سے اتارا جائے



ہم نے خدا کا رد لکھا نفی بہ نفی لایہ لایہ !  
 ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے  
 اُس کی وفا کے باوجود اُس کو نہ پا کے بدگماں  
 کتنے یقین بچھڑ گئے ، کتنے گماں گزر گئے  
 مجمعِ مہ و شاں سے ہم زحیمِ طلب کے باوجود  
 اپنی کلاہ کج کیے ، عشوہ کسناں گزر گئے  
 خود نگرانِ دل زدہ ، دل زدگانِ خود نگر !  
 کوچہٗ التفات سے خود نگرانِ گزر گئے  
 اب یہی طے ہوا کہ ہم تجھ سے قریب تر نہیں  
 آج ترے تکلفاتِ دل پہ گراں گزر گئے  
 رات تھی میرے سامنے فردِ حسابِ ماہ و سال  
 دن مری سرخوشی کے دن ، جانے کہاں گزر گئے  
 کیا وہ بساطِ الٹ گئی؟ ہاں وہ بساطِ الٹ گئی  
 کیا وہ جواں گزر گئے؟ ہاں وہ جواں گزر گئے

خوش گذرانِ شہرِ عجم ، خوش گذراں گزر گئے  
 زمزمہ خواں گزر گئے ، رقص کسناں گزر گئے  
 وادیِ غم کے خوش خرام ، خوش نَفسانِ تلخ جام  
 نغمہ زناں ، نوا زناں ، نغمہ زناں گزر گئے  
 سوختگاں کا ذکر کیا ، بس یہ سمجھ کہ وہ گروہ  
 صرصر بے اماں کے ساتھ ، دستِ قشاں گزر گئے  
 زہر بہ جامِ ریختہ ، زحیم بہ کامِ بیختہ  
 عشرتیاںِ رنقِ عجم ، نوش چکاں گزر گئے  
 اُس درِ نیمِ وا سے ہم حلقہ بہ حلقہ صف بہ صف  
 سینہ زناں گزر گئے ، جامہ دریاں گزر گئے

لے طور فارسی سے لذت اندوز ہونے کے لیے گروہ کے واسطے جمع کا فعل استعمال کیا گیا۔ جز

دشت میں قصہ شوق بہار اب کہاں، بادِ پیمانی دیوانہ وار اب کہاں  
 بس گزرنے کو ہے موسمِ ہاے دہڑ تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے  
 ہم ہیں رسوا کنِ دلی و لکھنؤ، اپنی کیا زندگی اپنی کیا آبرو  
 تیر دلی سے نکلے گئے لکھنؤ، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

ہے بھرنے کو یہ مغلِ رنگِ بو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے  
 ہر طرف ہو رہی ہے یہی گفتگو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے  
 ہر متاعِ نفسِ نذرِ آہنگ کی، ہم کو یادوں ہوس تھی بہت رنگ کی  
 گلِ زین سے ابلنے کو ہے اب او، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے  
 اولِ شب کا متاب بھی جا چکا صحنِ میخانہ سے اب افق میں کہیں  
 آخرِ شبھے، خالی ہیں جامِ دسبو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے  
 کوئی حاصل نہ تھا آرزو کا مگر، سانحہ یہ ہے اب آرزو بھی نہیں  
 وقت کی اس مسافت میں بے آرزو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے  
 کس قدر دور سے لوٹ کر آئے ہیں، یوں کو عسبر برباد کر آئے ہیں  
 تھا سرب اپنا سرمایہ جستجو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے  
 اک جنوں تھا کہ آباد ہو شہرِ جاں، اور آباد جب شہرِ جاں ہو گیا  
 ہیں یہ سرگوشیاں در بہ در کو بہ کو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

رو بہ زوال ہو گئی مستی حال شہر میں  
 اب کہیں اوج پر نہیں تیرا خیال شہر میں  
 یہ جو کراہتے ہوئے لوٹ رہے ہیں شہر سے  
 خوب دکھا کے آئے ہیں اپنا کمال شہر میں  
 شہرِ وفا میں ہر طرف سو دوزیاں کا ہے شمار  
 لائیں گے اب کہاں سے ہم کوئی مثال شہر میں  
 حالتِ گفتگو نہیں عشرتِ آرزو نہیں  
 کتنی اُداس آتی ہے شامِ وصال شہر میں  
 خاک نشیں ترے تمام خانہ نشین ہو گئے  
 چار طرف ہے اڑ رہی گردِ لال شہر میں

ہم رہے پر نہیں رہے آباد  
 یاد کے گھر نہیں رہے آباد  
 کتنی آنکھیں ہوئیں ہلاکِ نظر  
 کتنے منظر نہیں رہے آباد  
 ہم کہ اے دل سخن تھے سرتاپا  
 ہم لبوں پر نہیں رہے آباد  
 شہرِ دل میں عجب محلے تھے  
 ان میں اکثر نہیں رہے آباد  
 جانے کیا واقعہ ہوا کیوں لوگ  
 اپنے اندر نہیں رہے آباد

کیا ہوئے صورت نگاراں خواب کے  
خواب کے صورت نگاراں کیا ہوئے  
یاد اُس کی ہو گئی ہے بے اُماں  
یاد کے بے یادگاراں کیا ہوئے

کیا ہوئے آشفته کاراں کیا ہوئے  
یادِ یاراں یار ، یاراں کیا ہوئے  
اب تو اپنوں میں سے کوئی بھی نہیں  
وہ پریشاں روزگاراں کیا ہوئے  
سو رہا ہے شام ہی سے شہرِ دل  
شہر کے شب زندہ داراں کیا ہوئے  
اُس کی چشمِ نیم وا سے پوچھو  
وہ ترے مژگاں شماراں کیا ہوئے  
اے بہارِ انتظارِ فصلِ گل  
وہ گریباں تار تاراں کیا ہوئے

اب نکل آؤ اپنے اندر سے  
 گھر میں سامان کی ضرورت ہے  
 ہم نے جانا تو ہم نے یہ جانا  
 جو نہیں ہے وہ خوبصورت ہے  
 خواہشیں دل کا ساتھ چھوڑ گئیں  
 یہ اذیت بڑی اذیت ہے  
 لوگ مصروف جانتے ہیں مجھے  
 یاں مرا غم ہی میری فرصت ہے  
 آج کا دن بھی عیش سے گزرا  
 سر سے پاتک بدن سلامت ہے

کوئی حالت نہیں یہ حالت ہے  
 یہ تو آشوب ناک صورت ہے  
 انجن میں یہ میری خاموشی  
 بُردباری نہیں ہے وحشت ہے  
 طنز پیرایہ تبسم میں  
 اس تکلف کی کیا ضرورت ہے  
 تجھ سے یہ گاہ گاہ کا شکرا  
 جب تک ہے بسا غنیمت ہے  
 گرم جوشی اور اس قدر کیا بات!  
 کیا تمہیں مجھ سے کچھ شکایت ہے  
 تو بھی اے شخص کیا کرے آئندہ  
 مجھ کو سر پھوڑنے کی عادت ہے

وہ جو اپنی جاں سے گزر گئے انہیں کیا خبر ہے کہ شہر میں  
 کسی جاں نثار کا ذکر کیا کوئی سوگوار بھی اب نہیں  
 نہیں اب تو اہل جنوں میں بھی وہ جو شوق شہر میں عام تھا  
 وہ جو رنگ تھا کبھی کو بہ کو سر کو سے یار بھی اب نہیں

نہ ہوا نصیب قرارِ جاں ہوسِ قرار بھی اب نہیں  
 ترا انتظار بہت کیا ترا انتظار بھی اب نہیں  
 تجھے کیا خبر مرہ و سال نے ہمیں کیسے زخم دیے یہاں  
 تری یادگار تھی اک خلش تری یادگار بھی اب نہیں  
 نہ گلے رہے نہ گماں رہے نہ گزارشیں ہیں نہ گفتگو  
 وہ نشاطِ وعدہ وصل کیا ہمیں اعتبار بھی اب نہیں  
 یہ ہے نامِ رشتہ رنگاں نہ شکایتیں ہیں نہ شوخیاں  
 کوئی عذر خواہ تو اب کہاں کوئی عذر دار بھی اب نہیں  
 کسے نذر دیں دل و جاں بہم کہ نہیں وہ کاکلِ خم بہ خم  
 کسے ہر نفس کا حساب دیں کہ شمیم یار بھی اب نہیں  
 وہ ہجومِ دل زدگاں کہ تھا تجھے مژدہ ہو کہ بکھر گیا  
 ترے آستانے کی خیر ہو سر رہ غبار بھی اب نہیں

ہم تو جیسے وہاں کے تھے ہی نہیں  
 بے اماں تھے اماں کے تھے ہی نہیں  
 ہم کہ ہیں تیری داستاں بیکسر  
 ہم تری داستاں کے تھے ہی نہیں  
 ان کو آندھی میں ہی بکھڑنا تھا  
 بال و پر آشیاں کے تھے ہی نہیں  
 اب ہمارا مکان کس کا ہے  
 ہم تو اپنے مکان کے تھے ہی نہیں  
 ہو تری خاکِ آستاں پہ سلام  
 ہم ترے آستاں کے تھے ہی نہیں  
 ہم نے رنجش میں یہ نہیں سوچا  
 کچھ سخن تو زباں کے تھے ہی نہیں

زرد ہوائیں، زرد آوازیں، زرد سرے شامِ خزاں  
 زرد اُداسی کی وحشت ہے اور فضاے شامِ خزاں  
 شیشے کے دیوار و در ہیں اور پاسِ آداب کی شام  
 میں ہوں میری بیزاری ہے اور صحراے شامِ خزاں  
 سورج پٹیوں پار مچکا ہے شاخوں میں لالی پھوٹی  
 مہکے ہیں پھراکِ گم گشتہ رنگ کے سایے شامِ خزاں  
 پیلے پتوں کی سمتوں میں ناچ اٹھے ہیں سبز طال  
 اب تک بے احوال نہیں ہے موجِ ہوائے شامِ خزاں  
 تنہائی کا اکِ جگمگ ہے ستارے اور ہوا  
 پٹیوں کے پیلے پتے ہیں نغمہ سرے شامِ خزاں

دل نے ڈالا تھا درمیاں جن کو  
لوگ وہ درمیاں کے تھے ہی نہیں  
اُس گلی نے یہ سُن کے صبر کیا  
جانے ولے یہاں کے تھے ہی نہیں

کرتا ہے ہا ہُو مجھ میں  
کون ہے بے قابو مجھ میں  
یادیں ہیں یا بلوا ہے  
چلتے ہیں حقائق مجھ میں  
لے ڈوبی جو نانا مجھے  
تھا اس کا چہرہ مجھ میں  
جانے کن کے چہرے ہیں  
بے چشم و ابرو مجھ میں  
ہیں یہ کس کے تیغ و علم  
بے دست و بازو مجھ میں  
جانے کس کی آنکھوں سے  
بہتے ہیں آنسو مجھ میں



ڈھونڈتی ہے اک آہ کو  
 اک مادہ آہر مجھ میں  
 آدم ، ابلیس اور خدا  
 کوئی نہیں بیکو مجھ میں  
 میں تو ایک جہنم ہوں  
 کیوں رہتا ہے تو مجھ میں  
 جن کہیں موجود نہیں  
 میرا ہم پسلا مجھ میں

بادِ بہاری کے چلتے ہی لہری پاگل چل نکلے  
 جانا تھا کس سمت کو جانے لیس بے اٹکل چل نکلے  
 جو پہل مائے تھے ان کو دوش نہ دو زردوش ہیں وہ  
 دوش ہمیں دو اُس بستی سے ہم بے پہل چل نکلے  
 پاس ادب کی حد ہوتی ہے ہم پہلے ہی کتے تھے  
 کل تک جن کو پاس تھا ان کا وہ اُن سے کل چل نکلے  
 کچھ مت پھوپھو حیف آتا ہے وحشت کے بے حالوں پر  
 وحشت جب پُر حال ہوتی تو چیخوڑ کے جنگل چل نکلے  
 خون بھی اپنا سیر طلب تھا ہم بھی موجی رنگ کے تھے  
 یوں بھی تھا نزدیک ہی مقتل سوے مقتل چل نکلے

اب بھی بساں مژدہ ہے  
 ایک خزاں خوشبو مجھ میں

شام ہی سے دکان دید ہے بند  
نہیں نقصان تک دکان میں کیا  
اے مرے صبح و شام دل کی شفق  
تو نہاتی ہے اب بھی بان میں کیا  
بولتے کیوں نہیں مرے سہتی میں  
اسلے پڑ گئے زبان میں کیا

خامشی کہہ رہی ہے کان میں کیا  
آ رہا ہے مرے گمان میں کیا  
دل کہہ آتے ہیں جس کو دھیان بہت  
خود بھی آتا ہے اپنے دھیان میں کیا  
وہ ملے تو یہ پوچھنا ہے مجھے  
اب بھی ہوں میں تری امان میں کیا

## دو غزلہ

عمر گزرے گی امتحان میں کیا  
داغ ہی دیں گے مجھ کو دان میں کیا  
میری ہر بات بے اثر ہی رہی  
نقص ہے کچھ مرے بیان میں کیا  
مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں  
یہی ہوتا ہے حنا دان میں کیا  
اپنی محرومیاں چھپاتے ہیں  
ہم غریبوں کی آن بان میں کیا  
خود کو جانا جُدا زمانے سے  
آگیا تھا مرے گمان میں کیا

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو  
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا  
ہے نسیم بہارِ گردِ آلود  
خاک اُڑتی ہے اُس مکان میں کیا  
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا  
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

شام ہوتی ہے یار آئے ہیں یاروں کے ہمراہ چلیں  
آج وہاں قولی ہوگی جونِ چلو درگاہ چلیں  
اپنی گلیاں اپنے رمنے اپنے جنگل اپنی ہوا  
چلتے چلتے وجد میں آئیں راہوں میں بے راہ چلیں  
جانے بستی میں جنگل ہو یا جنگل میں بستی ہو  
ہے کیسی کچھ نا آگاہی آؤ چلو ناگاہ چلیں  
کوچ اپنا اُس شہر طرف ہے نامی ہم جس شہر کے ہیں  
کپڑے پھاڑیں خاک بہ سر ہوں اور بہ عزتِ وجاہ چلیں  
راہ میں اُس کی چلنا ہے تو عیش کرا دیں قدموں کو  
چلتے جائیں، چلتے جائیں یعنی خاطر خواہ چلیں

کیسے پہنچے غنیمت تک یہ خبر  
گھر گیا ہوں میں اپنے لشکر میں  
ایک دیوار گر پڑی دل پر  
ایک دیوار کھنچ گئی گھر میں

سالہا سال اور اک لمحہ  
کوئی بھی تو نہ ان میں بل آیا  
خود ہی اک در پہ میں نے دستک دی  
خود ہی لڑکا سا میں نکل آیا

میں تو سودا لیے پھرا سر میں  
خاک اڑتی رہی مرے گھر میں  
نہ ہوا تو مجھے نصیب تو کیا  
میں ہی اپنے نہ تھا مقدر میں  
لے کے سمتوں کی ایک بے سمتی  
گم ہوا ہوں میں اپنے پکیر میں  
ڈوبیے اس نگہ کے ساتھ کہاں  
دھول ہی دھول ہے سمندر میں  
چلبیے کچھ ہنر کو اُس کا خیال  
ہے جو بے منظری سی منظر میں  
مانگ لے کوئی یاد پتھر سے  
دقت پتھرا گیا ہے پتھر میں

میں کیوں بھلا قضا و قدر سے بُرا بنوں  
 ہے جو بھی انتظام خدایا، درست ہے  
 ہے نیم منکروں کی معاش اس سوال پر  
 جب کچھ نہیں درست تو پھر کیا درست ہے؟

وہ کارگاہ ہوں جو عجب نادرست ہے  
 جو کچھ یہاں درست ہے بیجا درست ہے  
 ہر چند خود وجود میں ہیں سو سخن مگر  
 موجود مستی دل و دیدہ درست ہے  
 وہ جسم موج خیز پیالہ وہ ناف کا  
 گرداب، درمیانہ دریا درست ہے  
 جو کچھ ہے بیچ میں ہے، ادھر ہے نہ کچھ ادھر  
 ہم نے جو کام بیچ میں چھوڑا، درست ہے  
 گام سفر نے خوار کیا پائے سیر کو  
 منزل نہ درمیاں ہو تو رستا درست ہے  
 آتا بھی ہے کوئی تو میں کتا ہوں تو نہیں  
 اب تو مرے خیال میں تنہا درست ہے

ہاں وہ نگاہِ ناز بھی اب نہیں ماجرا طلب  
ہم نے بھی اب کی فصل میں شورِ بسپا نہیں کیا

## دو غزلہ

دل نے وفا کے نام پر کارِ وفا نہیں کیا  
خود کو ہلاک کر لیا خود کو وفا نہیں کیا  
خیرہ سرانِ شوق کا کوئی نہیں ہے جنبہ دار  
شہر میں اس گردہ نے کس کو خف نہیں کیا  
جو بھی ہو تم پہ معترض اُس کو یہی جواب دو  
آپ بہت شریف ہیں آپ نے کیا نہیں کیا  
نسبتِ علم ہے بہت حاکمِ وقت کو عزیز  
اُس نے تو کارِ جسٹس بھی بے علم نہیں کیا  
جس کو بھی شیخ و شاہ نے حکمِ خدا دیا قرار  
ہم نے نہیں کیا وہ کام ہاں بہ خدا نہیں کیا

آج لبِ گرفتار آپ نے وا نہیں کیا  
تذکرہٴ نجاتِ آب و ہوا نہیں کیا  
کیسے کہیں کہ تجھ کو بھی ہم سے ہے واسطہ کوئی  
تو نے تو ہم سے آج تک کوئی گلہ نہیں کیا  
جانے تری نہیں کے ساتھ کتنے ہی جبر تھے کہ تھے  
میں نے ترے لحاظ میں تیرا کہا نہیں کیا  
مجھ کو یہ ہوش ہی نہ تھا تو مرے بازوؤں میں ہے  
یعنی تجھے ابھی تک میں نے رہا نہیں کیا!  
تو بھی کسی کے باب میں عہد شکن ہو غالباً  
میں نے بھی ایک شخص کا قرض ادا نہیں کیا

کیا سحر ہو گئی دل بے خواب!  
اک دھواں اٹھ رہا ہے بستر سے

## دو غزلہ

نکل آیا میں اپنے اندر سے  
اب کوئی ڈر نہیں ہے باہر سے  
صبح دفتر گیا تھا کیوں انسان  
اب یہ کیوں آ رہا ہے دفتر سے  
میرے اندر کجی بلا کی ہے  
کیا مجھے کھینچتا ہے مسطر سے  
دن کو جاتا ہوں پر نہیں معلوم  
اعرش ہوں میں کس کے لشکر سے  
اہل مجلس تو سوئیں گے تادیر  
اپ کب اُترے گا منبر سے

گزر آیا میں چل کے خود پر سے  
اک بلا تو ملی مرے سر سے  
مستقل بلستا ہی رہتا ہوں  
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے  
مجھ سے اب لوگ کم ہی ملتے ہیں  
یوں بھی میں ہٹ گیا ہوں منظر سے  
میں حسد کو چہ جُبدائی تھا  
سب گزرتے گئے برابر سے  
حجرہ صد بلا ہے باطن ذات  
خود کو تو کھینچیں نہ باہر سے

نہیں بدتر کہ بدترین ہوں میں  
ہوں نخل اپنے نصف بہتر سے  
بول کر داد کے فقط دو بول  
غون تھکوا لو شعبہ گر سے

وہ جو تھے رنگ میں سرتار، کہاں ہیں جانے  
زخم دارانِ رہ دار کہاں ہیں جانے  
ہر طرف شہرِ غم یار میں سناٹا ہے  
شورِ مستانِ غم یار کہاں ہیں جانے  
گھر سے جاتے ہیں خریدار پلٹ آتے ہیں  
جنسِ کیاب کے بازار کہاں ہیں جانے  
اے میجا ترے دکھ سے ہے سوادکھ کس کا  
کس سے پوچھوں، تے بیمار کہاں ہیں جانے  
میرا کیا اپنا طرفدار نہیں میں خود بھی  
وہ جو ہے اس کے طرفدار کہاں ہیں جانے

اب جو ڈر ہے مجھے تو اس کا ہے  
اندر آجائیں گے وہ اندر سے



اپنے زخموں کو نہیں کوئی کھرچنے والا  
کارِ جاناں، ترے بے کار کہاں ہیں جانے  
قافلوں کا ہے سرِ دشتِ طلب کب سے پڑاؤ  
ایلیسا! قافلہ سالار کہاں ہیں جانے

ہُو کا عالم ہے یہاں نالہ گروں کے ہوتے  
شہر خاموش ہے شوریدہ سروں کے ہوتے  
کیوں شکستہ ہے ترانگ متاعِ صد رنگ  
اور پھر اپنے ہی خونیں جگروں کے ہوتے  
کارِ فریاد و فغاں کس لیے موقوف ہوا  
تیرے کوچے میں تے باہنروں کے ہوتے  
کیا ودانوں نے تے کوچ ہے بستی سے کیا  
ورنہ سنان ہوں راہیں نگھروں کے ہوتے  
جُز سزا اور ہو شاید کوئی مقصود اُن کا  
جا کے زنداں میں جو بہتے ہیں گھروں کے ہوتے  
شہر کا کام ہوا فرطِ حفاظت سے تمام  
اور چھپانی ہوئے سینے سپروں کے ہوتے

اپنے سودا زدگاں سے یہ کہا ہے اُس نے  
چل کے اب آئیو پیروں پہ سڑوں کے ہوتے  
اب جو رشتوں میں بندھا ہوں تو کھلا ہے مجھ پر  
کب پزند اڑ نہیں پاتے ہیں پروں کے ہوتے

شہر کا کیا حال ہے پوچھو خبر  
آسماں کیوں لال ہے پوچھو خبر  
اب کے سینہ اُس بدن افکار کا  
کس بدن کی ڈھال ہے پوچھو خبر  
کیوں ہے آفراس گلی میں اژدہام  
کون پُر احوال ہے پوچھو خبر  
راہ میں اُس شہسوارِ ناز کی  
کس کا دل پامال ہے پوچھو خبر  
یہ جو ستانا ہے سارے شہر میں  
کیا نیسا جنجال ہے پوچھو خبر

ہمارے زخمِ تمتا پرانے ہو گئے ہیں  
 کہ اُس گلی میں گئے اب زمانے ہو گئے ہیں  
 تم اپنے چاہنے والوں کی بات مت سُنو  
 تمہارے چاہنے والے دو آنے ہو گئے ہیں مُعِیم  
 وہ زُلف دھوپ میں فرقت کی آئی ہے جب یاد  
 تو بادل آئے ہیں اور شامیانے ہو گئے ہیں  
 جو اپنے طور سے ہم نے کبھی گزائے تھے  
 وہ صبح و شام تو جیسے فسانے ہو گئے ہیں  
 عجب مہک تھی مرے گل تے بستیاں کی  
 سو بلبلوں کے وہاں آشیانے ہو گئے ہیں  
 ہمارے بعد جو آئیں انھیں مبارک ہو  
 جہاں تھے کُنچ وہاں کارخانے ہو گئے ہیں

رنگ لایا ہے عجب رنجِ خارِ آخرِ شب  
 حالت آئی ہے ہم آغوش میں یادِ آخرِ شب  
 حسرتِ رنگ بھی ہے خواہشِ نیرنگ بھی ہے  
 دیدنی فصلِ گماں کی ہے بہارِ آخرِ شب  
 جو نہی بوجھل ہوئیں بلکیں تو پڑی مستوں میں  
 اُس کی دُزدیدہ نگاہی کی چپکارِ آخرِ شب  
 صبح ہوگی مگر اس خواب سے کچھ کم ہوگی  
 عجب اک خواب ہے خوابوں کا دیارِ آخرِ شب  
 جاگے دینا ہے سحر دم ترے کپے میں حساب  
 کہ ہے ہیں ترے زند اپنا شمارِ آخرِ شب

کیا ہے بھری ہے جو محض کہ ہیں دل پُر محض  
رقص برپا ہے سہ راگزار آخر شب  
ہر پلک کا گزاری میں نگہ کی ہو بسر  
آخر شب ہے سو آنکھوں میں گزار آخر شب

اپنے جنوں کا پھر سرد ساناں ہے خواب خواب  
ان راتوں ایک زلف پریشاں ہے خواب خواب  
پھیلی ہوئی ہے یاد کی گلیوں میں چاندنی  
اک خواب اک خیال کا مہاں ہے خواب خواب  
راہیں مہک رہی ہیں مری لغزشوں کے ساتھ  
میں خواب خواب شہر غزالاں ہے خواب خواب  
دل دشت کے سفر پہ چلا ہے دیار سے  
ہنگامہ امید بہاراں ہے خواب خواب  
آنکھوں میں ہیں سچی ہوئی شکوں کی خلوتیں  
ہم اُس سے اور وہ ہم سے گریزاں ہے خواب خواب  
ہیں کھیلنے کو رنگ نیا، زخمہاے دل  
جاناں سے تازہ وعدہ و پیمان ہے خواب خواب

دل میں کھلی ہوئی ہیں دکائیں خیال کی  
تازہ حسابِ دست و گریباں ہے خوابِ خواب  
اک بزز بزز جھیل میں کشتی ہے سُرخ سُرخ  
اک جسمِ خوابِ خواب ہے اک جاں ہے خوابِ خواب  
بستی میں ہے فراق کی مزمم وصال کا  
دشوار جو بہت ہے وہ آساں ہے خوابِ خواب

آغازِ شاعری سے ۱۹۵۷ء تک

## اسکالیشِ امروز

اس سے پہلے کہ گزر جائیں یہ لمحاتِ نشاط

اس سے پہلے کہ یہ کلیاں بھی فسودہ ہو جائیں

اس سے پہلے کہ بدل جائے مزاجِ احساس

اس سے پہلے کہ یہ حالات بھی مُردہ ہو جائیں

اس سے پہلے کہ بدل جائے نظر کا انداز

اس سے پہلے کہ نظاروں کو نظر لگ جائے

اس سے پہلے کہ لباسِ شبِ خاموش ہو چاک

اس سے پہلے کہ ستاروں کو نظر لگ جائے

جذبہٴ شوق کو اظہار پہ آمادہ کرو

لبِ خاموش کو گفتار پہ آمادہ کرو

سرو مہری بھی زمانے کی ہے اس کو معلوم  
اس نے تاریخ کے ہر زخم کو بھرتے دیکھا

اس نے بابل کے طرب خیز چمن زاروں میں  
رنگِ تاریخ نکھرتے ہوئے دیکھا ہو گا  
یہ اجنتا و ایورا کے سیہ خانوں پر  
اُن کی شب ہلے درخشاں میں بھی چمکا ہو گا

وقت گزرا ہے، گزرتا ہے، گزر جائے گا  
سازِ امروز کا ہر تار بکھس جائے گا

لے متاعِ دل و جاں! رات گزر جائے گی  
وقت اک بات ہے اور بات گزر جائے گی  
حُسن اور عشق کے پابند نہیں ہیں لمحات  
فرصتِ شوق و عنایات گزر جائے گی

اور اگر تم کو محبت ہی نہیں ہے مجھ سے  
تو مرے بُت کدہ و ہم کو دیراں کر دو  
غلط اندازِ اداؤں کو ابھی سمجھا لو  
غلط اندیش و فاقوں کو پشیمان کر دو

حُسن کا عشق نگہاں، مگر اے جانِ جہاں  
وقت سے، شیوہ لمحات سے دل ہے لرزاں  
کون جانے کہ سرِ شام جلیں کیسے چسراں  
کس کو معلوم، دمِ صبح جوانی ہو کہاں

چاند، یہ رات کے سینے کا دکھتا ہوا داغ  
چاند، یہ کتنے ہی مایوس اندھیروں کا چراغ

اس نے اہرام کی تہذیب کو مرتے دیکھا  
بے نیازانہ زمانے کو گزرتے دیکھا

سازِ ہستی ہمہ تن سوز ہے اور کچھ بھی نہیں  
ہر سحر، شامِ غم اندوز ہے اور کچھ بھی نہیں  
صنعت و فلسفہ و فن و تختیل کا مال  
شاید آسائشِ امروز ہے اور کچھ بھی نہیں

## دو آوازیں

### پہلی آواز

ہمارے سرکار کہہ رہے تھے یہ لوگ پاگل نہیں تو کیا ہیں  
کہ فرقِ افلاس و زر مٹا کر نظامِ فطرت سے لڑ رہے ہیں  
نظامِ دولتِ خدا کی نعمت، خدا کی نعمت سے لڑ رہے ہیں  
ہر اک روایت سے لڑ رہے ہیں، ہر اک صداقت سے لڑ رہے ہیں  
مشیتِ حق سے ہو کے غافل خود اپنی قسمت سے لڑ رہے ہیں  
یہ لوگ پاگل نہیں تو کیا ہیں؟

ہمارے سرکار کہہ رہے تھے اگر سبھی مالدار ہوتے  
تو پھر ذلیل و حقیر پیشے ہر ایک کو ناگوار ہوتے



یہ ناتوان و نحیف و ناچار جن کے قدموں پہ زلزلے ہیں  
 یہ جن کو تم نے کچل دیا ہے یہ جن میں جینے کے سولے ہیں  
 دیا ہے فاقوں نے جسم جن کو جو بھوک کی گود میں پلے ہیں  
 یہ لوگ پاگل نہیں ہوتے ہیں

نظامِ فطرت؟

نظامِ فطرت ہوائے صحنِ چمن سے پھو جو پھینا ہے  
 شامِ دیر و دیار و دشت و دمن سے پھو جو پھینا ہے  
 نظامِ فطرت فضاؤں کی انجمن سے پھو جو پھینا ہے  
 نظامِ فطرت کو قلمِ موزن سے پھو جو پھینا ہے

کہ چاند سورج کی جگہ گاہٹ زمیں زمیں ہے وطنِ وطن ہے  
 کلی کلی کی کنواری خوشبو روش روش ہے چمن چمن ہے  
 نظامِ فطرت کا بحرِ تواجِ پست و بالا پہ موزن ہے  
 ہوائیں کب اس کو دیکھتی ہیں کہ یہ ہے صحرا وہ انجمن ہے

نہ کارخانوں میں کام ہوتا نہ لوگ مصروفِ کار ہوتے  
 انہیں سے پوچھو کہ پھر زمانے میں کس طرح کاروبار ہوتے  
 اگر سبھی مالدار ہوتے

تو مسجد و مندر و کلیسا میں کون صنعت گری دکھاتا  
 ہمارے راجوں کی اور شاہوں کی عظمتیں کون پھر جگاتا  
 حسین تاج اور جلیسل اہرام ڈھال کر کون داد پاتا  
 ہماری تاریخ کو فروغِ ہنس سے پھر کون جگاتا  
 ہمارے سرکار کہہ رہے تھے یہ لوگ پاگل نہیں تو کیا ہیں؟

دوسری آواز

تم اپنے سرکار سے یہ کہنا یہ لوگ پاگل نہیں ہوتے ہیں  
 یہ لوگ سب کچھ سمجھ رہے ہیں یہ لوگ سب کچھ سمجھ چکے ہیں  
 یہ زرد رُو نوجوان فنکار جن کی رگ رگ میں ولولے ہیں

تم اپنے سرکار سے یہ کہنا، نظام زر کے نظم و ضبط خوار و  
نظام کہنہ کی ہڈیوں کے مجاور و اور فروش کار و  
تمہاری خواہش کے برخلاف اک نیا تمدن طلوع ہو گا  
نیا فائدہ نیا ترانہ نیا زمانہ شروع ہو گا

جمود و جنش کی رزم گاہوں میں ساعتِ جنگ آپکی ہے  
سماج کے استخوان فروشوں سے زندگی تنگ آپکی ہے

تمہارے سرکار کہہ رہے تھے، یہ لوگ پاگل نہیں تو کیا ہیں؟  
یہ لوگ جمہور کی صدا ہیں یہ لوگ دنیا کے رہنما ہیں  
یہ لوگ پاگل نہیں ہوتے ہیں

وہ پیشے جن سے عروس تہذیب کوٹے ہیں لباس و زیور  
ہے جن سے دوشیزہ تمدن چمن بزم بہار دربر  
ہے جن کا احساں تمہاری اصلوں تمہاری نسلوں پہ اور تم پر  
انہیں کو تم گالیاں بھی دیتے ہو اب ذلیل و حقیر کہہ کر

سنو کہ فردوسی زمانہ پرکھ چکا ظرفِ غزنوی کو  
جو منکر و فن کو ذلیل کر کے عزیز رکھتا ہے اشرفی کو  
تقدس بُت شکن میں دیکھا تکلفِ ذوقِ بُت گری کو  
اب ایک ہجو جدید لکھنی ہے عصر حاضر کی شاعری کو

تم اپنے سرکار سے یہ پوچھو کہ منکر و فن کی سزا یہی ہے  
ہو ان کا دل خون جن کے دم سے یہ تازگی ہے یہ دلکشی ہے  
وہ جن کے خون سے نقوش و اشکال کو درخشندگی ملی ہے  
وہ جن کے ہاتھوں کی کھر دراہٹ سے کشتِ تارِ حریر لگی ہے

نئی منزل کی راہ ڈھونڈو تم  
میرے غم سے پناہ ڈھونڈو تم

بھول جاؤ تمام رشتوں کو  
چاک کر دو مرے نوشتوں کو

گلِ حسرت کھلا نہ سمجھو تم  
مجھ کو اپنا صلہ نہ سمجھو تم

ہر نفس جاں کنی ہے جینے میں  
اک جہنم ہے میرے سینے میں

یہ مرے کربِ ذات کے آثار  
شوقِ تعبیر کے خرابے ہیں

## مفروضہ

آرزو کے کنول کھلے ہی نہ تھے  
فرض کر لو کہ ہم ملے ہی نہ تھے

کسی پہچان کی نظر سے یساں  
اصل چہرے کہاں گزرتے ہیں  
زندگی میں تمام چیزوں کو  
ہم فقط فرض ہی تو کرتے ہیں

ان خرابوں میں جاں کنی نے مری  
خون تھوکا ہے زخم چا بے میں

## عیدِ زنداں

اہلِ زنداں عیدِ زنداں آئی ہے  
نکمتِ صحنِ گلستاں آئی ہے  
مژدہ بادے حسرتِ شبِ زندہ دار  
آرزوئے صبحِ خیزاں آئی ہے  
روحِ صبح و شام با صد اشتیاق  
پاے کوباں دستِ انشاں آئی ہے  
زندگی کی دُورِ اُفتادہ خوشی  
خندہ برب لبِ اشکِ انشاں آئی ہے  
اے خس و خاشاکِ راہِ نازکاں  
ساعتِ تقریبِ مژگاں آئی ہے

وقت کے جسم کی خراش ہوں میں  
اپنے اندر سے پاش پاش ہوں میں

ذات ہے اعتبارِ ذات نہیں  
اب تو میں خود بھی اپنے سات نہیں

کج کلاہ کشورِ جہاں فارہہ  
 کج کلاہ کشورِ جہاں آئی ہے  
 اے دلِ بربط نوازِ آرزو  
 نوبتِ تارِ رگِ جہاں آئی ہے  
 کتنی سادہ دل ہے میری زندگی  
 مجھ سے محبوب دیشیاں آئی ہے  
 جو آنِ آخر گیا کرو گے نذرِ شوق؟  
 ارجمندِ ارجمنداں آئی ہے

پیش کر دے اے دلِ اندوہگیں  
 درد، جو آبِ متابلِ دریاں نہیں  
 تشنگی، جو زہر پی کر رہ گئی  
 خوش دلی، جو آنسوؤں میں بہہ گئی

ارجمندِ ارجمنداں کیا کہوں  
 زندگی ہے کس قدر زار و زبوں

جانبِ برقطِ اللہی کے ساتھ  
 منزلِ مجازہ راناں آئی ہے  
 اے سمیرا، اے عنینہ، اے نوجوا  
 نازشِ مرگاں درازاں آئی ہے  
 اے عزیزانِ قبیلہ مژدہ باد  
 قرۃ العینِ عزیزاں آئی ہے  
 دستہ دستہ داعیہاے دلِ سبحیں  
 خوش نگاہِ خوش نگاہاں آئی ہے  
 آج توخوں سے جلانے ہیں چراغ  
 آج تو شامِ چہراں آئی ہے  
 نعرہ یا بانالہ یا فریادِ با!  
 جانِ نادریاں پذیراں آئی ہے  
 سازِ با، آوازِ با، شہنازِ با!  
 مطربِ جاں، جانِ جاناں آئی ہے  
 تاجدارِ نجدِ خوباں فارہہ  
 تاجدارِ نجدِ خوباں آئی ہے

ہے زمانہ میرے حق میں بے نوبہ  
 میں ہوں اپنی آرزوؤں کا شہید  
 آرزوئیں ناری کا جبر ہیں  
 زندگی میں زندگی کا جبر ہیں  
 پھر جوے شیر بھی شیریں بھی ہے  
 حُسن بھی ہے حیلہ سنگیں بھی ہے

## خواب

کبھی اک خواب سا دیکھا تھا میں نے  
 کہ تم میری ہو اور میرے لیے ہو  
 تمہاری دلکشی میرے لیے ہے  
 میں جو کچھ ہوں تمہارے ہی لیے ہوں  
 تمہاری ہر خوشی میرے لیے ہے

فن کے حق میں حیلہ سنگیں ہے جبر  
 جوے شیر و تیشہ خونیں ہے جبر  
 موج خیز جبر میں ہم تہ نشیں  
 انتخابِ موج پر متاد نہیں

وہ راتیں آہ وہ سرمست راتیں  
 کہ جن کی تشنہ لب سرتیوں نے  
 سرورِ تشنگی بننا تھا مجھ کو

وہ راتیں خواب ہو کر رہ گئی ہیں  
 مگر خوابوں میں خوابوں کا تسلسل  
 عذابِ جاں بھی ہے جاں آفریں بھی  
 یہ زنجیرِ خیال و خواب و ادہام  
 فریبِ زندگی بھی ہے یقین بھی

سلا کر حال کی تائیکیوں میں  
 مجھے ناضی میں چونکاتے ہیں یہ خواب  
 مری پلکوں کو بوجھل دیکھتے ہی  
 سمٹ جاتے ہیں شرماتے ہیں یہ خواب  
 میں ان خوابوں سے جب بھی روٹھتا ہوں  
 تو پہروں اشک برساتے ہیں یہ خواب  
 مجھے بانہوں کے حلقے میں جکڑ کر  
 مرے سر کی قسم کھاتے ہیں یہ خواب  
 مرا آغوش اپنانے کی خاطر

تمہاری والہانہ بیخودی نے  
 غرورِ دلبری بخشا تھا مجھ کو  
 تمہارے جسم کی جاں پوری نے  
 جلالِ سردی بخشا تھا مجھ کو  
 ہماری باہمی انگریزوں نے  
 یقینِ زندگی بخشا تھا مجھ کو

یقینِ جاں فزا، خوابِ تمنا  
 عذابِ روح بن جائے گا اک دن  
 کبھی میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا  
 یہ ہو گی خواب کی تعبیر یعنی  
 کہ میں نے خواب دیکھا ہی نہیں تھا  
 جو میری آرزو کا نقشِ گرہ ہے  
 کبھی وہ دور گزرا ہی نہیں تھا

زمانے بھر کو ٹھکراتے ہیں یہ خواب  
شوق پر روکتے ہیں اپنا آپنل  
انق میں جا کے چھپ جاتے ہیں یہ خواب

## متاعِ زندگی کو مارا ہوں

میں تیرے نامہ ہائے شوقِ تجھ کو  
بہ صد آزدگی کوٹا رہا ہوں  
ترا رازِ دلی ہے ان میں نہیں  
ترا رازِ دلی کوٹا رہا ہوں  
تری ”دیوانگی“ کی داستانیں  
بہ صد دیوانگی کوٹا رہا ہوں  
حیاتِ ناامیدی کے سہارے  
بہ کربِ جانکشی کوٹا رہا ہوں

جہاں کچھ بھی نہیں تنہا خلا ہے  
نظر کا سارا سرمایہ حلا ہے



مجھے صحت کی تاکیدیں ہیں جن میں  
 وہ ”احکامِ شہی“ کوٹا رہا ہوں  
 مجھے تو نے کبھی کیا کچھ لکھا تھا  
 وہی ”کیا کچھ“ وہی کوٹا رہا ہوں  
 ”مرے شاعر، مرے معبود و مالک“  
 یہ اعزازات بھی کوٹا رہا ہوں  
 فقط اک ”کوہکن“ رہنا ہے مجھ کو  
 غرورِ خسروی کوٹا رہا ہوں  
 یہ خط میری متاعِ زندگی تھے  
 متاعِ زندگی کوٹا رہا ہوں  
 غمِ ترکِ محبت آہ یہ عنم  
 میں اپنی ہر خوشی کوٹا رہا ہوں

## آزادی

اپنے ہاتھوں اُجڑ رہا ہے چین  
 دلِ ماشاؤ و چشمِ ما روشن  
 بڑھ گئی اور چاکِ دانانی  
 جب سے حاصل ہیں رشتہ و سوزن  
 نہیں ہرگز مالِ فصلِ بہار  
 گل کی بیجا ہنسی کا پھیکا پن  
 اب خزاں کو نہ دے کوئی الزام  
 جل رہا ہے بہار میں گلشن  
 نظمِ فطرت، یہ کیا قیامت ہے  
 چاندنی رات اور چاند گہن

ہم نے بختے چراغِ محسن کو  
 رگِ جاں سے فتیلہ و روغن  
 اور دونوں ہیں شام سے تاریک  
 تیسرا آگن ہو یا مرا آگن  
 نعمتِ حال ہے یہ دل! یا ہے  
 لبِ ماضی کا دیر رس شیون  
 دین اور دھرم کی ہو خیر اپنے  
 یہ برہمن وہ شیخکِ پُر فن  
 ہم قفس سے رہا ہوئے تو کیا  
 دل میں آباد ہے قفس کی گھٹن

## بنامِ فارہہ

ساری باتیں بھول جانا فارہہ  
 تھا وہ سب کچھ اکِ فسانہ فارہہ  
 ہاں محبت ایک دھوکا ہی تو تھی  
 اب کبھی دھوکا نہ کھانا فارہہ  
 چھیڑ دے گر کوئی میرا تذکرہ  
 سُن کے طنزاً مسکرانا فارہہ  
 میری جو نظیں تمہارے نام ہیں  
 اب انہیں مت گنگنا فارہہ  
 تھا فقط روجوں کے نالوں کی ٹمکت  
 وہ ترنم ، وہ ترانہ فارہہ

سوچتا ہوں کس قدر تاریک ہے  
اب مرا باقی زمانہ فارہ

من رہا ہوں منزلِ غربت کے دور  
بج رہا ہے شایدیانہ فارہ

موج زن پاتا ہوں میں اک نیل رنگ  
از قفس تا آشیانہ فارہ

ہو مبارک زم تقریبِ شباب  
بر مرادِ خسروانہ فارہ

سج کے وہ کیسا لگا ہو گا جو تھا  
ایک خوابِ شاعرانہ فارہ

سوچتا ہوں میں کہ مجھ کو چاہیے  
یہ خوشی دل سے منانا فارہ

کیا ہوا گر زندگی کی راہ میں  
ہم نہیں شانہ بہ شانہ فارہ

بحث کیا کرنا بھلا حالات سے

ہارنا ہے ، ہار جانا فارہ

ساز و برگِ عیش کو میری طرح

تم نظر سے مت گرانا فارہ

ہے شعورِ غم کی اک قیمت مگر

تم یہ قیمت مت چھکانا فارہ

زندگی ہے فطرتاً کچھ بد مزاج

زندگی کے ناز اٹھانا فارہ

پیش کش میں پھول کر لینا قبول

اب ستارے مت منگانا فارہ

چند دیرانے تصور میں رہیں

جب نئی دنیا بنا فارہ

جانبِ عشرتِ تگرِ شہر بہار

ہو سکے تو مل کے جانا فارہ

لے اردو میں "فطرۃ" کے بجائے "فطرتاً" ہی درست ہے۔ جوآن

وقت شاید آپ اپنا جبر ہے  
 اس پہ کیا تہمت لگانا فارہہ  
 زندگی اک نقشِ بے نقاش ہے  
 اس پہ کیا انگلی اٹھانا فارہہ  
 کاش اک قانون ہوتا جو نہیں  
 زخم اپنے کیا دکھانا فارہہ  
 کاش کچھ اقدار ہوتیں جو نہیں  
 پھر بھلا دل کیا جلانا فارہہ  
 صرف اک جلتی ہوئی ظلمت ہے نور  
 تاب و تابش پر نہ جانا فارہہ  
 یہ جو سب کچھ ہے یہ شاید کچھ نہیں  
 روگ جی کو کیس لگانا فارہہ  
 سیل ہے بس، بکریاں لمحوں کا سیل  
 غرقِ سیلِ بیکرانہ فلہہ

## پچھتمکِ اہم

جشنِ آزادی کے موقع پر

حیاتِ نو، تری جیبِ اہلِ دیدہ میں  
 کیا تھا رشتہٴ اناس سے روہم نے  
 بتا صبیحہٴ محشرِ خرامِ آزادی  
 تجھے تلاش کیا تھا نہ کو بہ کو ہم نے  
 خزاں نصیب ہیں لیکن نگارِ گلشن کو  
 عطا کیا سرو سامانِ رنگ و بو ہم نے  
 کبھی مورخِ فصلِ جنوں سے کر معلوم  
 کیا ہے کتنے مقاتل کو سرخروہم نے

امام شہر سے پوچھ اُس نمازِ خوف کا حال  
کیا تھا جس کے لیے خون سے دھو ہم نے

ہو صرف چٹمک انجم نصیبِ خوش نظری  
یونہی تو کی تھی شعاعوں کی جستجو ہم نے

یہی کہو، ہمیں لب تشنگی ہی اس آئے  
پیا ہے زہرِ سلامت کنارِ جو ہم نے

خود اپنے آپ کو الجھایا، یہی تو کیا  
سوار کر تری زلفوں کو مو بہ مو ہم نے

کیا قبول پلاسِ درشتی گفتار  
بہ نقدِ ریشم تہذیبِ گفتگو ہم نے

ہو صرف باغچہ قصرِ اہلِ زر شاداب  
اسی غرض سے بہایا تھا کیا ہو ہم نے

نگاہ میں کوئی صورت، بہ جز غبار نہیں

یہ وہ بہار نہیں ہے یہ وہ بہار نہیں

## داغِ سینہ شب

نویدِ عشرتِ فردا کسے مبارک ہو

خیالِ انجمنِ آرا کسے مبارک ہو

یہ داغِ سینہ شب یہ ہلالِ عیدِ طرب!

دلِ فسردہ، بتانا کسے مبارک ہو

یہ طنزِ کوشِ تبتلی یہ طعنہ زنِ جلوہ

کوئی بتائے خدا را کسے مبارک ہو

سوال یہ ہے کہ اس زخمِ خوردہ گلشن میں

فسونِ خندہ بیجا کسے مبارک ہو

ہکارِ شوق و تمنا تمہے تنائی

ہیں نا امید تمنا کسے مبارک ہو

بہارِ رقص و تماشاً، ترے تماشائی  
تڑپ رہے ہیں تماشائے مبارک ہو  
کسی کا شیوہ الطاف کس کو اس آئے  
کسی کے عہد کا ایفا کیسے مبارک ہو

## تعظیمِ محبت

ہے مجھ پر طعنہ زن خود میرا احساس  
تمنا اپنی قیمت کھو رہی ہے  
کون کیا، ہر پلک اس بے خبر کی  
مری آنکھوں میں کانٹے بو رہی ہے  
عرق آلود چہرے کی ہر اک بوند  
نہ جلنے کتنے خاکے دھو رہی ہے  
خوشا یہ طرزِ تعظیمِ محبت  
یہ تعظیمِ محبت ہو رہی ہے  
غمِ فرقت کا شکوا کرنے والی  
مری موجودگی میں سو رہی ہے

تم بہت جاذب و جمیل سہی  
زندگی جاذب و جمیل نہیں  
نہ کرو بحث ہا رجاؤ گی  
حُسن اتنی بڑی دلیل نہیں ۱

## حُسن اتنی بڑی دلیل نہیں

آج بھی تشنگی کی قسمت میں  
تم قاتل ہے سببیل نہیں  
سب خدا کے وکیل ہیں لیکن  
ادھی کا کوئی وکیل نہیں  
ہے کشادہ ازل سے روعے زیں  
حرم و دیر بے فحیل نہیں  
زندگی اپنے روگ سے ہے تباہ  
اور دُراں کی کچھ سبیل نہیں

نسلوں پہ عذاب آ رہا ہو  
 قوموں کی سرسائیں جل رہی ہوں  
 سینوں میں جحیم گل لہے ہوں  
 ہونٹوں پہ صدائیں جل رہی ہوں

اُترا ہے افق میں تازہ تازہ  
 خورشید کا بے کفن جنازہ  
 خاموشی بام بڑھ رہی ہے  
 تاریکی شام بڑھ رہی ہے  
 ہر درزہ و در دھواں دھواں ہے  
 پہناے نظر دھواں دھواں ہے  
 احساس کے داغ جل اٹھے ہیں  
 کتنے ہی چراغ جل اٹھے ہیں  
 جیسے کوئی تل کے جا رہا ہو  
 جیسے کوئی یاد آ رہا ہو

## وقت

بام اور یہ منظرِ سرِ شام  
 ہے کتنا حسین و عبرت انجام

مغرب کا اُفق دکھ رہا ہے  
 دامنِ شفق بھڑک رہا ہے  
 تیز دھننے ہوئے ہوں جیسے  
 شعلے سے چپنے ہوئے ہوں جیسے

یا آتشِ سرکشی سے جیسے  
 دولت کی قبائیں جل رہی ہوں



جیسے کوئی جا کے بھول جائے  
وعدہ ہو مگر کبھی نہ آئے  
جیسے وہ مری متاعِ جاں بھی  
بے نام ہو اور بے نشان بھی

احساس ہے ابتلاے جاں ہا  
اظہار ہے فتنہٴ زباں ہا  
ہے از حرمِ یقیں بس اک دھند  
تاہیکلِ غطتِ گساں ہا  
از مشرقِ نفع و سودِ جلوہ  
تا مغربِ ظلمت و زیاں ہا  
ایسا ہے کہ یہ جہاں ہو جیسے  
تجسیمِ فسوںِ داستاں ہا  
ایسا ہے کہ یہ مکاں ہو جیسے  
انگوشِ وداعِ کارواں ہا

نادیدہ فضا میں کھو گیا ہوں  
آپ اپنا خیال ہو گیا ہوں  
ہے ذہن میں بیکراں زمانہ  
بے جسم حرامِ جادوانہ  
اقوام و ملل کی عُسر ہی کیا  
اک پل ہے سو پل کی عمر ہی کیا  
ہم تھے یہ کسی قدر بجا ہے  
ہم ہیں یہ خیال ہو گیا ہے  
وقت آپ ہی اپنی جاں کنی ہے  
آفات کی روح کھنچ رہی ہے  
یہ ہستیِ ناصبور کیا ہے  
میں کون ہوں، یہ شعور کیا ہے  
آفات میں برٹ کے رہ گیا ہوں  
نقطوں میں سمٹ کے رہ گیا ہوں

ہستی کا شہود ہی فنا ہے  
جو ہے وہ تمام ہو چکا ہے  
جو لمحہ ہے وہ گزر رہا ہے  
فریاد کہ وقت مر رہا ہے

ہے تنہا ہم نئے شام و سحر پیدا کریں  
اُس کو اپنے ساتھ لیں آرائشِ دنیا کریں  
ہم کریں قائم خود اپنا اک دبستانِ نظر  
اور اسرار و رموزِ زندگی افشا کریں  
دفترِ حکمت کے شک پرور مباحث چھیڑ کر  
شہرِ دانش کے نئے ذہنوں کو بہکایا کریں  
اپنی فکر تازہ پرور سے بہ اندازِ نویں  
حکمتِ یونان و مصر و روم کا احیا کریں  
ہو خلل انداز کوئی بھی نہ استغراق میں  
ہم یونہی تادیر آں سوے اتق دیکھا کریں  
رات دن ہوں کائناتی مسئلے پیشِ نظر  
اور جب تھک جائیں تو اُس شوخ کو چھیڑا کریں

جا کے ہر زخمی سے مانگیں رخصتِ مرہم نہی  
 ہر پریشاں حال رہو کے قدم چوما کریں  
 مست ہو کر سیرگاہِ شام سے نشی میں ہم  
 لڑکھڑائیں اور اپنے علم کو رُوا کریں  
 لڑکھڑاتے گنگناتے جھومتے گاتے ہوئے  
 بیخودی کی آخری حد تک چلے جایا کریں  
 زندگی کے مسئلے کچھ اور ہیں جانِ عزیز  
 یادہ گوئی کی بھی حد ہے سوچ کر بولا کریں

ترے بغیر بھی فطرت نے لی ہے انگڑائی  
 چمن میں تیرے نہ ہونے پہ بھی بہار آئی  
 مرا عندِ درِ نظر ناروا نہیں لیکن  
 ہے ماورائے نظر بھی جہاں کی رعنائی  
 جُدا سمجھ نہ خدا کو جہاں فطرت سے  
 خدا ہے خود اسی فطرت کی ایک خود رانی  
 نیازِ غیر سے کیا کام خود نائی کو  
 ہے خود ہی انجمنِ آرا یہ انجسمِ آرائی  
 ہے فرقِ دیر و حرم میں فقط یہی کہ حیات  
 یہاں ہے جانِ تمنا وہاں تمنائی

میں کیا بتاؤں کسی بے وفا کی مجھ جیسی  
کبھی خیال جو آیا تو آنکھ بھر آئی  
ستم نگاہ کا اپنی ہمیں نہ بھولے گا  
یہ کم نہیں کہ تیرے دل میں آگ بھڑکائی

ذکرِ گل ہو خار کی باتیں کریں  
لذت و آزار کی باتیں کریں  
ہے مشامِ شوق محرومِ شمیم  
زلفِ عنبرِ بار کی باتیں کریں  
دور تک خالی ہے صحراے نظر  
آہوے تاتار کی باتیں کریں  
آج کچھ ناساز ہے طبعِ خسرو  
زرگسِ بیدار کی باتیں کریں  
یوسفِ کنعان کا ہو کچھ تذکرہ  
مصر کے بازار کی باتیں کریں

اڈے نختہ نصیبو ، مفسو  
دولتِ بیدار کی باتیں کریں  
جہن آڈ کارواں در کارواں  
منزلِ دشوار کی باتیں کریں

دستِ جنوں کو کارِ نمایاں بھی ہیں عزیز  
یاروں کو شہر بھر کے گریباں بھی ہیں عزیز  
اب عقل و آگہی سے ہے اپنا معلما  
لیکن معاملاتِ دل و جاں بھی ہیں عزیز  
مجموعہ خیال کی تنقید بھی ہے منرض  
پر ہم کو تھتہ ہاے بزرگاں بھی ہیں عزیز  
ناقوسیانِ شہرِ متاں سے ہے ربطِ خاص  
سرمنزلِ حرم کے حُدیٰ خواں بھی ہیں عزیز  
یوں ہو کہ ہند و پاک کی سرحد پہ جا بسیں  
ہندو بھی ہیں عزیز مسلمان بھی ہیں عزیز

کتنے ظالم ہیں جو یہ کہتے ہیں  
توڑ لو پھول ، پھول چھوڑو مت  
باغباں ہم تو اس خیال کے ہیں  
دیکھ لو پھول ، پھول توڑو مت

برگشتگانِ جاہِ عرفان میں ہے شمار  
برگشتگانِ جاہِ عرفان بھی ہیں عزیز  
شہنشاہ ہی اب نبردِ کون کا علاج ہے  
پر کچھ سحرِ رخاںِ شبستاں بھی ہیں عزیز

دھرم کی بانسری سے راگ نکلے  
وہ سوراخوں سے کالے ناگ نکلے  
رکھو دیر دھرم کو اب تعقل  
کتنی پاگل یہاں سے بھاگ نکلے  
وہ گنگا جل ہو یا ہو آبِ زمزم  
یہ وہ پانی ہیں جن سے آگ نکلے  
خدا سے لے لیا جنت کا وعدہ  
یہ زاہد تو بڑے ہی گھاگ نکلے  
ہے آخر آدمیت بھی کوئی شے  
تسے دربان تو بُل ڈاگ نکلے

یہ کیا انداز ہے اے نکتہ چینی  
کوئی تنقید تو بے لاگ بھلے  
پلایا تھا ہمیں امرت کسی نے  
مگر منہ سے لہو کے جھاگ نکلے

بستمِ شعار، نشانے تلاش کرتے ہیں  
کردِ گلہ تو بہانے تلاش کرتے ہیں  
نشاطِ قصرِ نشینی کا تذکرہ نہ کرو  
ابھی تو لوگ ٹھکانے تلاش کرتے ہیں  
تھاری زلف کی خاطر بہ ایس پریشانی  
وہ صرف ہم ہیں جو شانے تلاش کرتے ہیں  
جنہوں نے خود ہی بگاڑا ہے اپنے چہرے کو  
وہ لوگ آئینہ خانے تلاش کرتے ہیں  
دلِ حزیں ترے نالوں میں شائقینِ ہنر  
بصدِ خلوص ترانے تلاش کرتے ہیں

حقیقتیں کہ ہیں سنگیں، انہیں بھلانے کو  
حقیقتوں میں فسانے تلاش کرتے ہیں  
کبھی خوابہ نشینوں پہ طنز مت کرنا  
یہی تو ہیں جو خزانے تلاش کرتے ہیں

مہک اٹھا ہے آہن اس خبر سے  
وہ خوشبو لوٹ آئی ہے سفر سے  
جدائی نے اُسے دکھا سبِ بام  
دریچے پر شفق کے رنگِ بُرے  
میں اس دیوار پر چڑھ تو گیا تھا  
اتارے کون اب دیوار پر سے  
گلہ ہے اک گلی سے شہرِ دل کی  
میں لڑتا پھر رہا ہوں شہر بھر سے  
اُسے دیکھے زلزلے بھر کا یہ چاند  
ہماری چاندنی سایے کو تر سے  
مرے مانند گزرا کر مری جاں  
کبھی تو خود بھی اپنی رگہند سے



کچھ دشت اہل دل کے حوالے ہوئے تو ہیں  
 ہمراہ کچھ جنوں کے رسالے ہوئے تو ہیں  
 مانا بچھے ہیں تیر سخن زہرِ طہنہ میں  
 سانچے میں التفات کے ڈھالے ہوئے تو ہیں  
 گر ہو سکا نہ چارہ آشتی تو کیا  
 آشتی سر کو لوگ سنبھالے ہوئے تو ہیں  
 دابستانِ زلف سے کھنچنا نہ چاہیے  
 کچھ بیچ تیری زلف میں ڈالے ہوئے تو ہیں  
 دشت میں کچھ خبر ہی نہیں کیا لکھا گیا  
 ادراق چند صبح سے کالے ہوئے تو ہیں

کیا ہے جو غیر وقت کے دھاووں کے ساتھ ہیں  
 وہ آئے ہم تو اُس کے اشاروں کے ساتھ ہیں  
 اک معرکہ بہار و خزاں میں ہے ان دنوں  
 ہم سب جواں مذاق بہاروں کے ساتھ ہیں  
 نادیدہ راہ لوگ ہوئے محسوس پہ بار  
 منزل شناس لوگ قطاروں کے ساتھ ہیں  
 حیرت یہ ہے کہ راہروانِ حسینِ ناز  
 سب کچھ ٹٹا کے شکر گزاروں کے ساتھ ہیں  
 ہم کو مٹانہ دیں یہ زمانے کی مشکلیں  
 لیکن یہ مشکلیں تو ہزاروں کے ساتھ ہیں

نہ کر قبول تماشائی چمن ہونا  
 ہے تجھ کو نازش نسرین دسترن ہونا  
 ابھی تو زور پہ سودا ہے بت پرستی کا  
 خدا دکھائے برہمن کا بُت شکن ہونا  
 کروں میں کیا رہ ہستی کے پیچ و خم کا گلہ  
 عزیز ہے تری زلفوں کا پُرشکن ہونا  
 کوئی صدا مرے کانوں میں اب نہیں آتی  
 ستم ہوا تھے نفسوں کا ہم وطن ہونا  
 یہ دلبری یہ نزاکت یہ کارِ شوق و طلب  
 مٹا گیا مجھے شیریں کا کوہکن ہونا  
 ہجومِ غم میں سجائی ہے میں نے بزمِ خیال  
 نظر جھکا کے ذرا پھر تو ہسم سخن ہونا

اب جنوں کب کسی کے بس میں ہے  
 اُس کی خوشبو نفس نفس میں ہے  
 حال اُس صید کا سنائیے کیا  
 جس کا صیاد خود قفس میں ہے  
 کیا ہے گر زندگی کا بس نہ چلا  
 زندگی کب کسی کے بس میں ہے  
 غیر سے رہیو تو ذرا ہشیار  
 وہ توے جسم کی ہوکس میں ہے  
 پا شکستہ پڑا ہوا ہوں مگر  
 دل کسی نعمتہ برس میں ہے  
 جوان ہم سب کی دسترس میں ہیں  
 وہ بھلا کس کی دسترس میں ہے

## بھائی (حضرت رئیس امرہ ہوی) کی نذر

تشنہ کامی کی سزا دو تو مزہ آ جائے

تم ہمیں زہر پلا دو تو مزہ آ جائے

میرے محفل بنے بیٹھے ہیں بڑے ناز سے ہم

ہمیں محفل سے اٹھا دو تو مزہ آ جائے

تم نے احسان کیا تھا جو ہمیں چاہا تھا

اب وہ احسان جتا دو تو مزہ آ جائے

اپنے یوسف کو زلیخا کی طرح تم بھی کہی

کچھ حسینوں سے ملاوہ تو مزہ آ جائے

چین پڑتا ہی نہیں ہے تمہیں اب میرے بغیر

اب جو تم مجھ کو گناہ دو تو مزہ آ جائے

ساری دنیا کے عشم ہمارے ہیں

اور ستم یہ کہ ہم تمہارے ہیں

دلِ برباد یہ خیال رہے

اس نے گیسو نہیں سنا کے ہیں

اُن رفیقوں سے شرم آتی ہے

جو مرا ساتھ دے کے ہائے ہیں

اور تو ہم نے کیا کیا اب تک

یہ کیا ہے کہ دن گزارے ہیں

اُس گلی سے جو ہو کے آئے ہوں

اب تو وہ راہرو بھی پیائے ہیں

جو ن ہم زندگی کی راہوں میں

اپنی تنہا روی کے مارے ہیں

یہ انبساطِ گلستاں یہ ارتعاشِ نسیم  
 اگرچہ کچھ بھی نہ ہوں اعتبار میں کیا ہے  
 غبارِ رنگِ فضا ہی میں پرفشاں رہتا  
 اس اہتمامِ نشستِ غبار میں کیا ہے

میری عقل و ہوش کی سب حالتیں  
 تم نے سانچے میں جنوں کے ڈھال دیں  
 کر لیا تھا میں نے عہدِ ترکِ عشق  
 تم نے پھر بائیں گلے میں ڈال دیں

ہو بزمِ راز تو آشوبِ کار میں کیا ہے  
 شرابِ تیغِ سہی ایک بار میں کیا ہے  
 مالِ کوکبئی بھی نہ ہو سکا حاصل  
 بجانے حیلہ شیریں شکار میں کیا ہے  
 جواب کچھ نہ ملے گا مگر سوال تو کر  
 کہ سوزِ غنچہ و صوتِ ہزار میں کیا ہے  
 ستمِ شعار نے خود کتنے زخم کھائے ہیں  
 کبھی شمار تو کرنا شمار میں کیا ہے  
 نزاکتوں نے پھوڑا ہے محنتوں کا لہو  
 نگار خانہ شہسود و دیار میں کیا ہے

شہر آباد کر کے شہر کے لوگ  
اپنے اندر بکھرتے جاتے ہیں  
روز افزوں ہے زندگی کا جمال  
ادھی ہیں کہ مرتے جاتے ہیں  
جوان یہ جسم کتنا کاری ہے  
یعنی کچھ زخم بھرتے جاتے ہیں

دل کے ارمان مرتے جاتے ہیں  
سب گھروندے بکھرتے جاتے ہیں  
مہل صبح نو کب آئے گی  
کتنے ہی دن گزرتے جاتے ہیں  
سکراتے ضرور ہیں لیکن  
زیر لب آہ بھرتے جاتے ہیں  
تھی کبھی کوہ کن مری شیریں  
اب تو آداب برتے جاتے ہیں  
بڑھتا جاتا ہے کاروان حیات  
ہم اُسے یاد کرتے جاتے ہیں

اب مرے اشکِ محبت بھی نہیں آپ کو یاد  
 آپ تو اپنے ہی دامن کی نئی بھول گئے  
 اب کوئی مجھ کو دلائے نہ محبت کا یقین  
 جو مجھے بھول نہ سکتے تھے وہی بھول گئے  
 اور کیا چاہتی ہے گردشِ ایام کہ ہم  
 اپنا گھر بھول گئے اُس کی گلی بھول گئے  
 کیا کہیں کتنی ہی باتیں تھیں جو اب یاد نہیں  
 کیا کریں ہم سے بڑی بھول ہوئی بھول گئے

مستیِ حال کبھی تھی کہ نہ تھی بھول گئے  
 یاد اپنی کوئی حالت نہ رہی بھول گئے  
 حرمِ ناز و ادا تجھ سے بچھڑنے والے  
 بُتِ کرمی بھول گئے بت شکنی بھول گئے  
 کوچہٴ کج کُلہاں تیرے وہ ہجرت زدگان  
 خود سری بھول گئے خود نگر می بھول گئے  
 یوں مجھے بھیج کے تنہا سر بازارِ فریب  
 کیا مرے دوست مری سادہ دلی بھول گئے  
 میں تو بے حس ہوں مجھے درد کا احساس نہیں  
 چارہ گر کیوں روشِ چارہ گری بھول گئے  
 مجھے تاکیدِ شکیبائی کا بھیجا جو پیام  
 آپ شاید مری شوریدہ سری بھول گئے

نوائیں، نکلتیں، آسودہ چہرے، دلنشیں رشتے  
 مگر اک شخص اس ماحول میں کیا سوچتا ہو گا  
 ہنسی آتی ہے مجھ کو مصالحت کے ان تقاضوں پر  
 کہ اب اک اجنبی بن کر اسے پہچاننا ہو گا  
 دلیلوں سے دوا کا کام لینا سخت مشکل ہے  
 مگر اس غم کی خاطر یہ ہنر بھی سیکھنا ہو گا  
 وہ منکر ہے تو پھر شاید ہر اک مکتوب شوق اُس نے  
 سرانگشتِ حنائی سے خلاؤں میں لکھا ہو گا  
 ہے نصفِ شب، وہ دیوانہ ابھی تک گھر نہیں آیا  
 کسی سے چاندنی راتوں کا قصہ چھڑ گیا ہو گا  
 صبا! شکوہ ہے مجھ کو اُن دیرپوں سے، دیرپوں سے؟  
 دیرپوں میں تو دیکھ کے سوا اب اور کیا ہو گا

کبھی جب مدتوں کے بعد اس کا سامنا ہو گا  
 سولے پاس آدابِ تکلف اور کیا ہو گا  
 یہاں وہ کون ہے جو انتخابِ غم پہ قادر ہو  
 جو مل جائے وہی غم دوستوں کا مدعا ہو گا  
 نویدِ سرخوشی جب آئے گی اُس وقت تک شاید  
 ہمیں زہرِ غم ہستی گوارا ہو چکا ہو گا  
 صلیبِ وقت پر میں نے پکارا تھا محبت کو  
 مری آواز جس نے بھی سنی ہو گی ہنسا ہو گا  
 ابھی اک شور ہاے وہو سنا ہے سارا بنوں نے  
 وہ پاگل قافلے کی ضد میں پیچھے رہ گیا ہو گا  
 ہمارے شوق کے آسودہ و خوشحال ہونے تک  
 تھکے عارضِ دگیسو کا سودا ہو چکا ہو گا

لے خوش اندیشگانِ عیشِ عیش  
ہم بھی اک دل شکن یقیں کے ہیں  
آبے ہیں ترے دیار سے دور  
رہنے والے تو ہم وہیں کے ہیں

ہم غزال اک ختن زمیں کے ہیں  
زخم خوردہ کسی حسین کے ہیں  
اے شکنجِ عنبرِ جہاں، ہم لوگ  
شکنِ زلفِ عنبریں کے ہیں  
اشک بے تاب ہیں سرِ مژگاں  
مذکرے اس کی آستیں کے ہیں  
ہے عجب انقلابِ وقت کہ اب  
وہ کہیں کے ہیں ہم کہیں کے ہیں  
شہرِ محنت میں بھی ہیں یاد وہ اشک  
اب جو قطرے مری جبین کے ہیں



یہ لٹجیاں یہ زخم یہ ناکامیاں یہ غم  
 ہے کیا ستم کہ اب بھی ترا مدعا ہوں میں  
 میں نے غم حیات میں تجھ کو بھلا دیا  
 حُسنِ وفا شعار بہت بے وفا ہوں میں  
 عشق ایک سچ تھا، تجھ سے جو بولا نہیں کبھی  
 عشق اب وہ جھوٹ ہے جو بہت بولتا ہوں میں

معصوم کس قدر تھا میں آغازِ عشق میں  
 اکثر تو اس کے سامنے شرمایا ہوں میں  
 دنیا مرے ہجوم کی آشوب گاہ ہے  
 اور اپنے اس ہجوم میں تنہا کھڑا ہوں میں  
 وہ اہل شہر کون تھے وہ شہر تھا کساں  
 ان اہل شہر میں سے ہوں اس شہر کا ہوں میں

غم ہاے روزگار میں الجھا ہوا ہوں میں  
 اس پر ستم یہ ہے اُسے یاد آ رہا ہوں میں  
 ہاں اس کے نام میں نے کوئی خط نہیں لکھا  
 کیا اس کو یہ لکھوں کہ لہو تھوکتا ہوں میں  
 کربِ غم شعور کا درماں نہیں شراب  
 یہ زہر بے اثر ہے اسے پی چکا ہوں میں  
 اے زندگی بتا کہ سیرِ جاوہِ شباب  
 یہ کون کھو گیا ہے کسے ڈھونڈتا ہوں میں  
 اے وحشتو! مجھے اُسی وادی میں لے چلو  
 یہ کون لوگ ہیں یہ کہاں آ گیا ہوں میں  
 شعر و شعور اور یہ شہرِ شمار و شور  
 بس ایک قرض ہے جو ادا کر رہا ہوں میں

مری جب بھی نظر پڑتی ہے تجھ پر  
 مری گھنٹام، جانِ دلِ رُبائی  
 مرے جی میں یہ آتا ہے کہ کلِ دوں  
 ترے گالوں پہ نیسی روشنائی

وہ کسی دن نہ آسکے پر اُسے  
 پاس وعدے کو ہو نبھانے کا  
 ہو بسرِ انتظار میں ہر دن  
 دوسرا دن ہو اُس کے آنے کا

جو حقیقت ہے اُس حقیقت سے  
 دور مت جاؤ، لوٹ بھی آؤ  
 ہو گئیں پھر کسی خیال میں گم  
 تم مری عادتیں نہ اپناؤ

## قطعت

ہے محبت حیات کی لذت  
 ورنہ کچھ لذتِ حیات نہیں  
 کیا اجازت ہے ایک بات کہوں؟  
 وہ.... مگر خیر کوئی بات نہیں

چاند کی پگھلی ہوئی چاندی میں  
 آؤ کچھ رنگِ سخن گھولیں گے  
 تم نہیں بولتی ہو؟ مت بولو  
 ہم بھی اب تم سے نہیں بولیں گے

شرم ، دہشت ، جھجک ، پریشانی  
ناز سے کام کیوں نہیں لیتیں  
”اے ، وہ ، جی ، مگر“ یہ سب کیا ہے  
تم مرا نام کیوں نہیں لیتیں

پسینے سے مے اب تو یہ رومال  
ہے تقدیر نازِ الفت کا خزانہ  
یہ رومال اب مجھی کو بخش دیجیے  
نہیں تو لابتے میرا پسینہ